گھر میں خیر خیریت ہو تو اس سے زیادہ تعجب خیز یا باعثِ تشویش کیا بات ہو سکتی ہے کہ سب اسی طرح سے جی رہے ہیں۔ بیوی سے پوچھا کہ میں سب کچھ ختم کر کے گیا تھا' تم نے یہ اتنا وقت کیسے گذارہ؟ اس نے کہا کہ وہ ٹھیک ہے؟ اناج وناج تو آپ اللہ کے راستے میں بانٹ گئے تھے' یہ بھینس ہمارے پاس موجود تھی۔ ہم نے اس کی بڑی خدمت کی۔ اس کا دودھ بیچا اور اس سے ہم گذارہ کرتے رہے۔ کہنے لگے کہ ہاں! اب معلوم ہوا کہ اتنی محنتوں' مشقتوں' ریاضتوں کے باوجود میں خدا کو کیوں نہیں پا سکا۔ ابھی خدا پر توکل پورا نہیں ہوا تھا۔ گھر میں بھینس تھی' انہوں نے وہ بھینس لی اور اس کو ذبح کیا اور اس کے بعد پھر اللہ کی تلاش میں نکل گئے کہ اب ''توکل علی اللہ'' کامل ہو جائے گا اور اب دیکھیے اللہ کہاں جاتا ہے صاحب! توکل کے یہ معنی آپ کے ہاں ہو گئے۔

ابلیس کا اپنے شاگردوں کے لیے پروگرام

تم اسے بیگانہ رکھو عالمِ کردار سے

یہ ابلیس کا وہ مشورہ' وہ پروگرام تھا' جو وہ اپنے شتونگڑوں کو' جنود کو' بنا کے دیتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اس امتِ محمدیہؐ کے تباہ کرنے کا راز اس میں ہے کہ یہ کہیں جاگ نہ اٹھے:

تم اسے بیگانہ رکھو عالمِ کردار سے
تا بساطِ زندگی میں اس کے ہر مہرے ہوں مات

ان میں کا ایک حربہ ''توکل علی اللہ'' بھی ہے کہ ذریعہ کوئی نہ رہے اور جو حضرات توکل علی اللہ کہتے ہیں وہ سب سے اچھا کھاتے پیتے ہیں۔ وہ صرف یہی ہوتا ہے کہ دوسرے کماتے ہیں اور یہ اس پہ عیش اڑاتے ہیں۔ اس کا نام توکل علی اللہ رکھا ہوا ہوتا ہے۔ ذرا ان خدام کا' ان مریدوں کا' وہاں آنا جانا بند کر دیجیے پھر حضرت صاحب سے پوچھیے کہ وہ توکل علی اللہ چھپر پھاڑ کے کیسے دیتا ہے؟ خدا نے خود یہ کہا ہے کہ یہ لوگ جو کہتے ہیں کہ خدا نے رزق دینا ہوتا تو خود دیتا' قرآنِ کریم نے تو یہ کفار کا قول نقل کیا ہے کہ ان پاگل کے بچوں سے کہو کہ وہ چھپر پھاڑ کے خود آ کے نہیں دیا کرتا۔ عالمِ انسانیت میں' عالمِ اسباب سے اسباب اور وسائل کے ذریعے سے دیا کرتا ہے اور یہ ہیں کہ انہوں نے ہر قسم کے وسیلے اور سبب کو کاٹنے اور توڑنے کا نام توکل علی اللہ رکھا ہے جبکہ توکل علی اللہ کے معنی ہیں: خدا کے قوانین پہ اتنا کامل بھروسہ کرنا ہے کہ وہ ٹوٹا نہیں کرتے' دغا نہیں دیا کرتے۔

توکل کے سلسلہ میں خدا کے قانون کی ایک محسوس مثال

اب جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا: بات نفسیات کی ہو رہی تھی۔ دعویٰ یہ تھا کہ خدا کا قانون بھروسے کے قابل ہے۔ اسے کیسے سمجھایا جائے؟ اس کا انداز وہی ہے کہ اپنے ہر تدریجی دعوے کو یہ Extract کرتا ہے۔ جب وہ کوئی دعویٰ کرتا ہے جو محسوس اور مرئی

Marfat.com

نہیں ہوتا تو اس کو ہمیشہ محسوس طریقے پر سمجھاتا ہے۔ اس کا عجیب انداز ہے۔ رَبُّكُمُ الَّذِیْ یُزْجِیْ لَكُمُ الْفُلْكَ فِی الْبَحْرِ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ اِنَّهٗ كَانَ بِكُمْ رَحِیْمًا(17:66)۔ کہا: دیکھتے نہیں ہو کہ بڑی بڑی کشتیاں' اتنا سامان لاد کر' کس طرح سمندر میں تیرتی چلی جاتی ہیں تا کہ تم ان کے ذریعے تلاشِ رزق کر سکو۔ اس کا یہ قانون کس قدر قابلِ بھروسہ ہے اور تمہارے لیے موجبِ رحمت ہے' سامانِ نشوونما کا موجب ہے۔ آج کی اِس مثال میں' میں سمجھاؤنگا کہ تم اتنی باریک سی سوئی پانی میں ڈالو تو وہ اسی وقت ڈوب جاتی ہے۔ اس کے برعکس اتنا بڑا لوہے کا جہاز کہ جس کا اپنا خالی وزن بھی ہزاروں ٹن ہوتا ہے' نہ صرف یہ کہ وہ پانی کے اوپر تیر رہا ہوتا ہے' بلکہ آپ اس میں وزن لادتے چلے جاتے ہیں۔ سامان لادتے چلے جاتے ہیں' لیکن پھر بھی وہ پانی پر تیرتا ہے۔ اس کا قانون یہ ہے کہ اگر یہ اتنا پانی Displace کر دے' ہٹا دے تو اس Displacement کی حد تک یہ تیرتا رہے گا۔ وہی پانی جو اس کے ڈوبنے کا ذریعہ تھا' وہ اس کی زندگی کا سہارا بن جائے گا۔ ہمارے اس قانون کا جہاز کے کپتان سے پوچھو۔ اس کی نگاہ ہمیشہ اس لکیر پر ہوتی ہے جو قانونِ خداوندی کے مطابق کھنچی ہوئی ہوتی ہے کہ اگر اس حد تک پانی کے اندر اس جہاز پر اتنا بوجھ ڈالا جائے' تو پھر یہ جہاز نہیں ڈوب سکتا' تیرتا رہے گا۔ طوفان آ جانا اور بات ہے لیکن نارمل حالات میں جو اس کے قوانین ہیں' ان کی رُو سے یہی ہوتا ہے۔

قرآن نے کہا کہ کبھی یہ بھی تم نے سوچا ہے کہ ایک لوہے کی سوئی تو پانی میں اسی وقت ڈوب جاتی ہے جبکہ اسی لوہے کا اتنا بڑا Grandeur جہاز کس طرح بمعہ اپنے سامان بطخ کی طرح سینۂ بحر پہ تیرتا ہوا چلا جاتا ہے۔ یہ خود بھی ہزاروں من کا ہوتا ہے۔ یہ کیسے ہو جاتا ہے؟ تم کس طرح بھروسے کے ساتھ کشتی میں بیٹھ جاتے ہو اور کہتے ہو کہ ہاں بھئی چلو ٹھیک ہے؟ اگر تمہیں پانی میں ڈوبنے والی چیز لیے لیے پھرتی ہے' تم خود ہی ایسا نہ کر لو کہ اس میں اُس لکیر کے نیچے تک بوجھ لاد دو۔ یعنی اس کے قانون کی خلاف ورزی کرو کہ اس میں اتنے مسافر اور بٹھا دو۔ یہ کشتیوں کے جتنے حادثے ہوتے ہیں اس کے بعد یہی پتہ چلتا ہے کہ صاحب! اس میں بیس کی Capacity تھی اور اس نے اس میں تیس بٹھا دیے۔ اس نے یہ قانون شکنی کی' اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ڈوب جاتا ہے۔ لیکن اگر اس کے قانون کے مطابق یہ کشتی اور اس کا وزن اس حد کے مطابق ہو اور سمندر میں کوئی غیر معمولی حادثہ نہ آ جائے تو وہ کبھی نہیں ڈوبتی۔ اسے توکل کہتے ہیں۔ یہ جو زمین پہ ایک کمرے کے اندر میز پہ بیٹھے ہوئے Calculation کرتے ہیں۔ وہ انسان ہی نہیں بلکہ اتنے بڑے جہازوں کو چاند پہ بھیج دیتے ہیں اور اب تو مریخ پہ بھیج رہے ہیں۔ وہ اس یقین کے ساتھ بھیج رہے ہوتے ہیں کہ اتنے بج کر اتنے سیکنڈ پر یہ وہاں پہنچ جائے گا۔ ان کی Split of the Second تک Calculation ہوتی ہے: یہ وہاں پہنچے گا' پھر یوں جائے گا' پھر Direction اس طرح بدلی جائے گی' یوں اترا' یوں گیا۔ یعنی یہ سب کچھ وہ یہاں بیٹھے ہوئے اس یقین کے ساتھ کنٹرول کر رہے ہیں۔ اس میں اس یقین کے ساتھ سوار ہو کے وہ چاند کی طرف' مریخ کی طرف' چلے جاتے ہیں اور پھر اس یقین سے وہ نیچے اترتے ہیں۔ ہم نے تو ان کا وہ اندازہ ٹی وی پہ دیکھا ہے۔ جہاں سمندر میں اترتے ہیں اس کے قریب ہی دوسرے جہاز موجود ہوتے ہیں اور کبھی Clash نہیں ہوا۔ یہ

Marfat.com

Calculation کیا ہے؟ یہ قانونِ خداوندی کا مطالعہ ہے۔ وَكَفٰى بِرَبِّكَ وَكِيْلًا (17:65) ۔ خدا کا نظام ربوبیت' نشوونما دینے کا نظام' ان کی کارسازی کے لیے کافی ہے۔ یہ اس پر بھروسہ کریں گے تو وہ کبھی انہیں دغا نہیں دے گا۔ ان چاند پہ جانے والوں سے پوچھو کہ خدا کس طرح سے بہترین وکیل بنتا ہے' توکل کسے کہا جاتا ہے۔ صاحب! وہ آپ کو بتائیں گے۔ بھینس کو ذبح کر کے' بچوں کو ٹکڑے مانگنے کے لیے چھوڑ دینے کو توکل نہیں کہتے۔ اِنَّهٗ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا (17:60)۔ اس کا یہ قانون تمہارے لیے رحمت کا موجب (Cause of Nourishment) ہے۔ اِن عام حالات میں تم نے اسے دیکھ لیا' اطمینان سے بیٹھے ہوئے ہوتے ہو اور ان میں تو خدا یاد بھی نہیں آتا۔

تدابیر کی انسانی کامیابی کا راز قانون خداوندی میں مضمر ہے

خدا یاد آتا ہے مگر کب؟ وَاِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِى الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ تَدْعُوْنَ اِلَّآ اِيَّاهُ (17:67)۔ جب وہ کشتی کسی مصیبت میں گھر جاتی ہے تو اس وقت صرف وہی تدابیر کارگر ہو سکتی ہیں جو قانون خداوندی کے مطابق اختیار کی جائیں۔ اس کے خلاف کسی ایسی قوت کی تدبیر' جسے تم حالتِ سکون میں پکارتے ہو' کارساز نہیں ہو سکتی۔ وہ گیارہویں والے کی اور سترھویں والے کی ''ہمارے ہاں ڈوبی ہوئی بیڑی (Boat) مشہور ہے'' جو انہوں نے بارہ برس کے بعد نکالی۔ وہ بیڑی کشتی تھی۔ برات کے ساتھ ڈوب گئی تھی' پھر ان گیارہویں والے پیر صاحب' جو گیارہویں والے اس لیے ہیں کہ گیارہ سال کے بعد (وہ ایک پہلا سال تو چلا گیا تھا' اس کے گیارہ سال بعد) انہوں نے وہ کشتی نکال دی تھی۔ کہیں اسی طرح اِدھر اُدھر کے مسافروں کے ساتھ ایک کشتی ڈوبنے لگی تو اس میں ایک مسخرہ سا (Clown-like) بھی بیٹھا ہوا تھا۔ وہ لنگوٹا باندھ کے کودنے لگا' تو اس سے سواریوں نے کہا: کیا کرنے لگے ہو؟ کہا: کودنے لگا ہوں۔ مسافر کہنے لگے کہ تم دیکھتے نہیں ہو کہ ہم نے پہلے سے ہی گیارہویں والے کی نیاز منت مان رکھی ہے' اس واسطے اس میں خطرے کی بات نہیں۔ اُس نے کہا کہ اس کے اوپر ہمیں بھی ایمان ہے کہ وہ نیاز منت آپ نے مان رکھی ہے' لیکن مشکل یہ ہے کہ وہ گیارہ سال کے بعد بیڑی نکالا کرتا ہے۔ ''دو ہور مینوں کم' ذرہ کل ہی ہیگے' تے فیر میں بھردے تے نئیں رہ سکدا۔''[1] قرآنِ کریم کہتا ہے: اس سے پیشتر تم جو بھی کیا کرتے تھے' جب وہ طوفان آیا کرتا ہے تو اس وقت سَتّی گم ہو جاتی ہے۔ قانونِ خداوندی کے خلاف کی گئی تمام تدابیر کارگر نہیں ہوتیں۔ تمہیں خدا کے علاوہ سب بھول جاتا ہے۔ فَلَمَّا نَجّٰىكُمْ اِلَى الْبَرِّ اَعْرَضْتُمْ (17:67) ۔ پھر جب وہ تکلیف Over ہو جاتی ہے اور مشکل سے نجات پا لیتے ہو' پھر تمہاری وہی کیفیت ہو جاتی ہے۔ تم اس کے قوانین کو بھول جاتے ہو۔ یہاں کہا: وَكَانَ الْاِنْسَانُ كَفُوْرًا (17:67)۔ یہ حقیقت ہے کہ انسان اگر وحیِ خداوندی کو چھوڑ کر صرف اپنے جذبات و خیالات کے تابع چلے تو بڑا

---

[1] کل ہی مجھے تو دو ایک اور کام ہیں' میں تو پھر اس بھروسے پر نہیں رہ سکتا۔

Marfat.com

ناسپاس گزار ہوتا ہے۔ کیا بات ہے قرآن میں الفاظ کے چناؤ کی! یہاں ''کفر'' سے جو یوں ''کفورًا'' کی بات کہی ہے! اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ مصیبت میں تو یہ بڑے بڑے بھی کسی نہ کسی طرح سے اِسے کچھ آوازیں دینے لگ جاتے ہیں لیکن اس کے لیے تو آپ کو وہ (ہندی) دوہا[1] جو سنایا کرتا ہوں' وہ سناتا ہوں' وہ بات بڑی کام کی ہے کہ:

دُکھ میں تو ہر کو بھجیں اور سُکھ میں بھجیں نہ کو
جو سُکھ میں ہر کو بھجیں تو دُکھ کاہے کو ہو

بہت اچھی بات کہی کہ ''دکھ میں ہر کو بھجیں''۔ ''بھجیں'' کے معنی پرستش کرنا ہوتا ہے اور ''ہر'' خدا کو کہتے ہیں۔ اس لیے دکھ یعنی مصیبت میں تو خدا کی پرستش ہوتی ہے' ان کے ہاں ہری ہری کا تصور ہے۔ اس لیے کہا کہ ''جو سکھ میں ہر کو بھجیں تو دکھ کاہے کو ہو۔'' دکھ میں تو ''ہر'' کو ''بھجیں'' اور سکھ میں ''بھجیں'' نہ کو۔

غلط معاشرے کی تباہی صحراؤں کی آندھی کی مانند ہوا کرتی ہے

زندگی کے ہر لمحے میں' ہر سانس میں' قوانینِ خداوندی کی اطاعت ہے اور اگر اس کے قوانین کے مطابق زندگی بسر کرتے رہا جائے تو پھر انسان کو کبھی بھی مشکلات اور مصائب کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ اگر انفرادی اور اجتماعی دونوں حیثیتوں سے قوانینِ خداوندی کی اطاعت ہوگی تو یہ چیز پوری ہو سکے گی۔ کہا کہ ٹھیک ہے' تمہاری کشتی ساحل پہ آ لگی' تم خشکی میں آ گئے اور اس کے بعد تم پھر قوانینِ خداوندی کو بھول گئے اور سمجھنے لگے کہ تم خدا کے قوانین کی زد سے باہر نکل آئے ہو۔ حالانکہ اس کے قوانین ساری کائنات کو محیط ہیں اور جو جس جگہ بھی ان کی خلاف ورزی کرتا ہے' وہیں پکڑا جاتا ہے۔ اَفَاَمِنْتُمْ اَنْ یَّخْسِفَ بِکُمْ جَانِبَ الْبَرِّ اَوْ یُرْسِلَ عَلَیْکُمْ حَاصِبًا ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَکُمْ وَکِیْلًا (17:68) تو کیا وہی جھکڑ جو سمندر میں آیا تھا' وہ یہاں خشکی میں' اسی قسم کا طوفان نہیں آ سکتا کہ یہاں جھکڑ آئے' اس کے اندر آندھی آئے۔ یہاں ہمارے ہاں تو خیر اس جھکڑ میں ریت ہی ملی ہوئی ہوتی ہے' صحراؤں کے اندر جہاں بہت کھلا تیز جھکڑ چلتا ہے تو اس میں وہ پتھر کی کنکریاں بھی ساتھ لے کے چلا آتا ہے۔ وہاں کی بڑی ہلاکت آمیز آندھی ہوتی ہے۔ کہا کہ خشکی پہ بھی تو ایسا ہو سکتا ہے یعنی خشکی اور تری کوئی بھی مقام ایسا نہیں ہے کہ جہاں اگر تم قوانینِ خداوندی سے بے نیاز ہو جاؤ تو وہاں کوئی اور ایسی چیز ہے جو تمہیں حفاظت دے سکتی ہے۔

قرآن کا تو انداز یہ ہے' جیسے میں نے کہا ہوا ہے کہ وہ بات سمجھانے کے لیے' کبھی ان اسباب کا ذکر کرتا ہے جو براہِ راست ہوتے ہیں کہ آندھی نے تمہیں ہلاک کر دیا' کبھی وہ خدا کے قوانین کے تابع خود خدا کے متعلق کہتا ہے کہ خدا اس طرح سے ہلاک کر دیا کرتا ہے۔

[1] دو مصرعوں کا ہندی شعر۔

Marfat.com

کہا کہ یہ کیفیت بھی تو وہاں پیدا ہو سکتی ہے۔ اَمْ اَمِنْتُمْ اَنْ یُّعِیْدَکُمْ فِیْهِ تَارَةً اُخْرٰی فَیُرْسِلَ عَلَیْکُمْ قَاصِفًا مِّنَ الرِّیْحِ فَیُغْرِقَکُمْ (17:69)۔ تو کیا پھر یہ دوبارہ نہیں ہو سکتا؟ تم یہ سمجھتے ہو کہ سمندر کے طوفان سے ایک دفعہ بچ نکلنے پر تم ہمیشہ کے لیے محفوظ اور مامون ہو گئے۔ یہ غلط ہے۔ تم نے ایک ہی بار تھوڑا سمندر میں' دریا میں' یا کشتی میں جانا تھا۔ یہ سواریاں' یہ سامان لادنے والے تو شاید ایک دو بار جاتے ہوں مگر ان کشتی والوں' جہاز والوں کا تو کام ہی یہی ہے۔ وہ ساری عمر ادھر سے وہاں' وہاں سے یہاں' چلتے رہتے ہیں تو کہا: ایک دفعہ اگر تم نے اس طرح سے حفاظت پالی' امن میں آ گئے اور پھر اس کے قوانین کو بھلا دیا تو پھر ایسا نہیں ہو سکتا کہ جب دوبارہ تمہارا جہاز جائے تو ویسی ہی صورت پیدا ہو جائے' سخت ہوا کا طوفان آئے جو تمہاری کشتی کو توڑ پھوڑ کر رکھ دے۔ پھر وہاں ڈوب جاؤ' اس لیے کہ تم نے اس کے قانون کی کسی شق کو نظر انداز کر دیا تھا۔ یہ اسی لیے ہے کہ جب ساحل پہ بھی جہاز آ جائے تو پھر بھی اس کے قوانین کی حفاظت کرو۔ دیکھو کہ تمہارے جہاز میں کوئی نقص تو نہیں پیدا ہو گیا ہے' کوئی خرابی تو کہیں نہیں پیدا ہو گئی۔ اسی لیے یہ جہازوں والے بندرگاہ میں آتے ہیں تو اتنا ہی کام نہیں ہوتا کہ وہ وہاں سے سامان کو اتارتے ہیں' دوسرا سامان لادتے ہیں۔ سامان والے تو یہ کر رہے ہوتے ہیں' مگر جہاز کے پرزوں کو بھی دیکھتے ہیں کہ کہیں اس کے قانون کی کسی شق کو تو نظر انداز نہیں کر دیا گیا۔

سفرِ زندگی میں ہر آن قانونِ خداوندی کی نگہداشت

ان کے ٹیکنیشنز (Technicians) اس جہاز کے ایک ایک کل پرزے کو پھر سے Examine کر رہے ہوتے ہیں' ٹیسٹ کر رہے ہوتے ہیں۔ اب تو وہ صرف کہنے کی ہی بات رہ گئی ہے' ورنہ ریلویز (Railways) میں بھی تو یہ انتظام ہوتا ہے۔ ریل میں ایگزامنیر (Examiner) کا مستقل عملہ ہوتا ہے اور ان کا یہ کام ہوتا ہے کہ ہر گاڑی چلنے سے پہلے ہر ڈبے کے متعلق وہ اطمینان کریں اور ان کو ایک سرٹیفکیٹ دینا پڑتا ہے کہ سب ٹھیک ہے۔ لیکن اب تو وہ سرٹیفکیٹ اسی قسم کے ہو جاتے ہیں کہ گھر سے خط آیا ہے کہ کل ان کا چہلم ہو گیا ہے۔ ان کا پائنیر (Pioneer) لکھتا ہے کہ بیمار کا حال اچھا ہے۔ اب یہ جتنے ٹرین ایگزامنر اور اس قسم کے لوگ سرٹیفکیٹ دیتے ہیں' وہ سب گھر میں بیٹھ کے دیتے ہیں کہ سب ٹھیک ٹھاک ہے اور ادھر گاڑی لاہور سے چل کر شاہدرہ کے سٹیشن پر پٹڑی سے اتری ہوئی ہوتی ہے۔ اس نے کہا ہے: جب تمہارا طوفان سے بچاؤ ہو جائے' جہاز یا کشتی ساحل پہ آ جائے تو اب اس کے بعد اس اطمینان میں نہ ہو جاؤ کہ نہیں صاحب! ان قوانین کے متعلق دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے: دیکھیے تو سہی' ہماری کشتی کنارے آ لگی۔ کہنے لگے: اس کشتی نے دوبارہ بھی پانی میں جانا ہے' اس لیے یہاں خشکی میں آ کر بھی اس کی طرف سے غافل نہ ہو جاؤ۔ دیکھو کہ آیا اب قوانینِ خداوندی کے مطابق اس کی ہر چیز ٹھیک ٹھاک ہے یا نہیں۔ یہاں اگر خشکی میں ٹھیک کر لو گے تو پھر یہ سمندر میں جا کے بھی درست رہے گی۔ یہ ہے وہ چیز کہ جب تم بظاہر حفاظت میں ہو' کوئی خطرہ بھی نہ ہو' تو اس وقت بھی اس کا خیال رکھو۔

Marfat.com

آج کی دیکھ بھال کل کی حفاظت کی ضامن ہے

فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (2:132)۔ زندگی کے ہر سانس میں موت تک اپنے آپ کو مسلم رکھو۔ اپنے آپ کو اس کے قوانین کے تابع رکھو۔ ہماری بہت سی مصیبتیں اور خاص طور پہ بیماریاں تو اسی لیے آتی ہیں کہ جب ہمیں مرض سے آرام مل جاتا ہے' شفا ہو جاتی ہے تو ہم بھول جاتے ہیں کہ ہمارے اندر کوئی ایسا نقص بھی ہے جس سے یہ بیماری یا مصیبت آئی۔ اس لیے مسلسل پرہیز کرنا چاہیے اور دوائی بھی جاری رکھنی چاہیے۔ شفا کے بعد یا مصیبت کے ٹل جانے کے بعد آدمی بھول جاتا ہے۔ اس وقت بھول جانے کا نتیجہ ہے کہ جب دوبارہ حملہ ہوتا ہے تو پہلے سے زیادہ شدید حملہ ہوتا ہے تو یہ جو اس نے کہا ہے کہ جب طوفانوں سے باحفاظت ساحل پہ آ جاؤ تو اس وقت بھی قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو کیونکہ تم نے دوبارہ بھی انہی پانیوں کے اندر جانا ہے۔ یہ ایک مثال تو وہ انہیں دے رہا ہے' تو زندگی کے ہر شعبے میں یہ ہے کہ جب بظاہر تم یہ سمجھو کہ بالکل حفاظت ہے' امن امان ہے' خیر خیریت ہے' اس وقت بھی یہ دیکھتے رہو کہ فی الواقعہ حفاظت ہے' خیر خیریت ہے۔ اس وقت بھی تم قوانینِ خداوندی کو نظر انداز نہ کرو۔ یاد رکھیے' دوبارہ وہی صورت پیدا ہو گئی تو پہلے سے زیادہ شدید حملہ ہو جائے گا۔

انسان کا طبعی شعبہ ہو یا انسانیت کا' دونوں قوانینِ خداوندی کے محتاج ہیں

کہا کہ یہ دیکھو' ہو سکتا ہے کہ تم اسی ابتلاء و آزمائش میں دوبارہ جاؤ اور پھر وہی صورتِ حال ہو جائے۔ یہاں پھر وہ لفظ آیا: فَيُغْرِقَكُمْ بِمَا كَفَرْتُمْ (17:69)۔ پھر "کفر" کا لفظ ہے۔ دیکھتے ہیں کفر کیا کیا ہے؟ کشتی یا جہاز کے متعلق یہ ٹیسٹ نہ کرنا کہ وہ اس کے قوانینِ طبعی کے مطابق ٹھیک ٹھاک ہے یا نہیں' یہ کفر ہے۔ وہ تو زندگی کا طبعی شعبہ ہو یا انسانیت سے متعلق کوئی معاملہ ہو' جہاں بھی اس کے قوانین نگاہوں سے اوجھل ہوئے' تم نے ان سے بے اعتنائی برتی' وہ کفر ہو گا' یا تم نے ان سے سرکشی برتی پھر وہ تو انتہا درجے کا کفر ہے۔

کشتی کی بات ہو رہی ہے۔ طوفانوں سے نکل کے وہ سلامتی میں آ گئی ہے۔ یہاں خشکی پر جو تمہیں دوبارہ جانے کا وقت دیا ہے' اس کے لیے جو مہلت کا وقفہ (Respite) ملا ہے' وہ کہتا ہے: اس مہلت کے وقفے میں بھی دیکھو کہ یہ کشتی اس قابل ہے کہ اگر اسے دوبارہ پانی میں ڈال دیا جائے تو یہ قوانین خداوندی کو نظر انداز تو نہیں کرے گی؟ كَفَرْتُمْ (17:69)۔ اور اس طرح یہاں آ کے بھی تم نے کفر اختیار کیا تو جب یہ دوبارہ پانی میں جائے گی تو ڈوب جائے گی۔ ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ عَلَيْنَا بِهٖ تَبِيْعًا (17:69)۔ تو یاد رکھو! یہ ہم کوئی مذاق کی بات نہیں کہہ رہے۔ جب بھی تم نے ہمارے قانون کے خلاف ایسا کیا اور کشتی پھر پانی میں ڈال دی' پھر تو ہمارا قانون اس کو ڈبو دے گا اور کوئی ایسا نہیں ہے' جو ہماری پیروی کرتا ہوا مقدمہ لڑے' ہمارے خلاف اپیل ہو جائے کہ ہم نے کیوں ایسا کیا؟ ہمارے ان

Marfat.com

قوانین کے خلاف کہیں اپیل ہو ہی نہیں سکتی۔ وہ سب سے بلند تر عدالت ہے۔ کہا: اس چیز کو دیکھیے اور اسی سلسلے میں کشتیوں کی مثالیں دیں۔ اس کے قوانین سے انکار کی مثالیں دیں۔

بنیادی حقوقِ انسانیت

کہا کہ یہ چیزیں، جو ہم نے بیان کی ہیں، یہ کوئی خاص قسم کے انسان نہیں جن کے متعلق یہ باتیں کی جا رہی ہیں۔ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ (17:70)۔ جتنے بھی بنی آدم ہیں، انسان ہیں، جنہیں ہم اپنے محاورے کی رو سے آدم کی اولاد کہا کرتے ہیں، انسانی بچے ہیں، انہیں ہم نے واجب التکریم پیدا کیا ہے۔ یہ بات کوئی پیدائش کے ساتھ نہیں ہے کہ انہیں عیسائیت کے عقیدے کے مطابق پیدا ہی مجرم کیا گیا ہو، پیدا ہی گناہگار کیا گیا ہو۔ اس کا تو سوال ہی نہیں ہے۔ جرم یا گناہ یا جسے سن (Sin) کہا جاتا ہے وہ تو خود انسان کرتا ہے، جب خدا کے قانون کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ ورنہ پیدائش کے اعتبار سے بنی آدم، ہر بچہ، خدا کے نزدیک واجب التکریم ہوتا ہے: كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ (17:70)۔ یہی وہ چیز ہے جو میں بار بار دہرایا کرتا ہوں کہ آپ جسے بنیادی حقوقِ انسانیت کہتے ہیں، اسے تو قرآن نے سرِ فہرست رکھا ہے: كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ (17:70)۔ یعنی صرف آدمی کا آدمی ہونے کی جہت سے تکریم اور احترام سرِ فہرست ہے:

اصلِ تعظیم احترامِ آدمی

آدمیت احترامِ آدمی

ہر انسان کے مدارج کا تعین اس کے اعمال کے مطابق

اس کا انسان ہونا، اسے تمام انسانوں کے برابر تعظیم و تکریم دیدیتا ہے۔ یہ بنیادی چیز ہے کہ کسی انسان میں انسان ہونے کی جہت سے کوئی فرق نہ کیا جائے، پیدائشی نسبت سے یکساں واجب التکریم سمجھا جائے۔ اس کے بعد کہا: وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ۭ (6:133)۔ اب ہر ایک کے اعمال کے مطابق ان کے مدارج مقرر ہونگے۔ ہر انسان کی بنیادی تکریم اور عزت یکساں ہوگی۔ اس کے خلاف یا اس کے مطابق، جو چیزیں اسے بعد میں دی جائیں گی، وہ اس کی سیرت اور کردار اور اعمال کے نتیجے میں ہونگی۔ خالی سلیٹ والا انسان (Clean Slate Man) یکساں واجب التکریم ہے۔ ہر انسانی بچہ یکساں واجب التکریم ہے اور اسی لیے میں نے لکھا بھی ہے کہ یہ Constitution کا خاصہ ہے، یہ مملکتِ اسلامیہ کا بنیادی دستور ہے کہ اس میں اگر کوئی چیز بغیر کسی جرم و خطا کے کسی انسان کے لیے وجہِ تذلیل ہو جائے، تو وہ مملکت کبھی اسلامی نہیں ہو سکتی، خواہ کسی طرح سے بھی کسی انسان کو ذلیل کیا جائے اور آپ جانتے ہیں کہ ذلیل کرنے کی تو مختلف نوعتیں ہوتی ہیں۔

Marfat.com

قابلِ نفرت بنانا مجرم کا جرم ہوتا ہے' انسان قابلِ نفرت نہیں ہوتا

عزیزانِ من! کسی کو قابلِ نفرت بنا دینا جرم ہے۔ یہ اس بنیادی حقِ انسانیت کے خلاف چلا جائے گا' جس میں قرآن کہتا ہے کہ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ (17:70)۔ ہم نے تمام فرزندانِ آدم کو واجب التکریم بنایا اور اس بنیادی حق میں تو مومن اور کافر کی بھی کوئی تمیز نہیں ہے۔ مجرم تو بات ہی اور ہو جائے گی اور جب میں آگے چل کے جزا اور سزا (Reward and Punishment) پہ آؤنگا تو وہاں تو عجیب چیزیں آئیں گی اور یہ چیز صرف قرآن میں ہی آپ کو ملے گی کہ ''مجرم کا صرف جرم ہی قابلِ نفرت ہوتا ہے' وہ انسان قابلِ نفرت نہیں ہوتا۔'' یہ فعل جو اس سے سرزد ہوا ہے' وہ قابلِ نفرت ہے۔ جب وہ اسے چھوڑ دیتا ہے تو اس کی عزت برقرار ہو جاتی ہے صاحب! یہ فرق کرنا ہے' ورنہ انسان کی حیثیت تو وہی رہتی ہے۔ اس سے صرف یہ ایک جرم سرزد ہو گیا ہے' جرم کی سزا دیجیے۔ ٹھیک ہے' سزا دی گئی باقی انسان رہ گیا' وہ دھبہ دھل گیا۔ یہ انسان رہ گیا۔ یہ صورت نہیں ہے کہ وہ انسان قابلِ نفرت ہو گیا' وہ تو اب بنی آدم ہو گیا۔ اس کے ساتھ یہ جتنی چیزیں ہیں' یہ اضافی (Relative) ہیں۔ اس لغزش کے باوجود' آدم آدم ہی رہا تھا جب اس نے یہ کہہ دیا ہے کہ رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا (7:23)۔ بارِالٰہی! مجھ سے اپنی ذات میں کمی ہو گئی' میں اپنے نفس پر ظلم کر بیٹھا۔ ٹھیک ہے وہ صاف ہو گیا۔ وہ آدم پھر آدم ہی تھا' وہ ذلت کا موجب نہیں بن گیا ہے۔ وہ بنی آدم رہا ہے: وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ (17:70)۔ اور وہ واجب التکریم ہی رہا۔ پھر یہاں اس طبعی زندگی کے اندر انسان کی بات ہو رہی ہے' صرف مومن کی نہیں۔ اس انسان کو قوانینِ طبعی کا وہ علم دیا گیا ہے جس کی بنا پر وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ (17:70)۔ خشکیوں اور تریوں میں جتنی بھی فطرت کی قوتیں ہیں' وہ اس کے تابعِ تسخیر کی ہوئی ہیں۔ اسے کس قدر خوشگوار سامانِ حیات دیا جا رہا ہے۔ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا (17:70)۔ یہاں ایک بات آئی ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان کو ہم نے فضیلت دی ہے۔ یہ بات بڑی غور طلب ہے۔ ہم نے جو کچھ پیدا کیا ہے' جو بھی خدا کی Creation ہے' اس میں سے اکثر پر اسے فضیلت اور برتری دی ہے۔

صرف انسان ہی اشرف المخلوقات نہیں

آپ کو معلوم ہے کہ یہ انسان کو اشرف المخلوقات کہتے ہیں اور یہ ایسے ہی کہہ دیتے ہیں جیسے کہ یہ خدا کی طرف سے ایک مسلمہ ہے۔ کبھی کسی نے اس بات کو چیلنج ہی نہیں کیا یعنی مخلوقِ خداوندی میں سب سے زیادہ شرف اور فضیلت کے مالک ہونے کے تصور کو کسی نے چیلنج ہی نہیں کیا ہے۔ یہ ٹھیک ہے۔ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ (17:70)۔ قرآن نے کہا ہے کہ یہ واجب التکریم ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا ہے کہ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا (17:70)۔ ہماری مخلوق میں کثیر ایسی ہے جس پر اسے فضیلت دی

Marfat.com

ہے۔اس نے سب پہ نہیں کہا۔ خدا کی مخلوق کا تو ہم احاطہ ہی نہیں کر سکتے۔ہاں! یہ تو ہوسکتا ہے اور غالباً ہے کہ اس کرۂ ارض پہ جو مخلوق ہے اس پہ تو اسے افضلیت حاصل ہے لیکن مخلوقِ خداوندی کرۂ ارض تک ہی تو محدود نہیں ہے۔

قرآن نے کہا ہے کہ اجرامِ فلکی میں بھی متنفس ہیں

قرآن تو یہ بتاتا ہے کہ یہ جو اجرامِ فلکی ہیں' جو تمہیں تیرتے ہوئے (Spheres) نظر آتے ہیں۔ان میں بھی دآبہ موجود ہیں۔یہ کس قسم کے ہیں' یہ خدا نے نہیں بتایا اس لیے کہ وہاں انہیں انسان یا حیوان یا مویشی نہیں کہا' انہیں متنفس کہا ہے: سانس لینے والے' چلنے والے کہا ہے۔ معلوم نہیں کس کس نوعیت کے' کس کس کرے کے اندر' اور کہاں کہاں یہ چیز ہوگی۔خدا کی کائنات Universe کا تو احاطہ ہی نہیں کیا جاسکتا۔یہ تو آج تک تصور میں بھی نہیں آسکی۔یہ ہمارے ہاں جو بڑے بڑے Scientists ہیں' وہ اس کا تصور نہیں کر سکے۔کہتے ہیں کہ یہ جو لامحدود ہے' وہ تو رہا ایک طرف' یہ جسے آپ کہکشاں (Galaxy) کہہ رہے ہیں' اس کے متعلق بھی تصور نہیں کیا جاسکتا کہ اس میں کتنی دنیائیں آباد ہیں۔وہ ہمیں تو نیچے سے ایسے ہی نظر آیا کہ جیسے ہمارے ہاں کے شاعر نے یہ لکھ دیا: ''اور کہتا تھا کہکشاں' جیسے کچی زمین کے اوپر سے گھاس کا ایک گٹھڑ ہو اور اس کو کوئی کھینچ کے لیے جارہا ہو' تو پیچھے جیسا نشان بن جاتا ہے۔'' ہمیں تو بس اتنا ہی پتہ چلا ہے۔

خدا تعالیٰ نے تو اس کائنات میں لاکھوں ملک اور اربوں شہر آباد کر رکھے ہیں

کسی ماہرِ فلکیات سے پوچھیے' کیا کہتا ہے؟ وہ کہتا ہے کہ اس وقت تک' جو ہم نے بڑی سے بڑی دوربین Telescope بنائی ہے' اس میں اس کہکشاں کا ایک انچ ٹکڑا بھی نہیں سماتا اور اس قسم کی لاتعداد دنیائیں ہیں' جنہیں تم ''کھنچی ہوئی گھاس'' کہہ رہے ہو۔وہ کہتا ہے کہ یہ تو ابھی کچھ شے ہی نہیں ہے۔اس لیے کہ یہ جو مِمَّنْ خَلَقْنَا (17:70) ہے یعنی اپنے آپ کو اشرف المخلوقات کہنا ہے' یہ تو اپنے منہ آپ میاں مٹھو بنتے جانا ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ یہ قرآن کے خلاف ہے۔قرآن کریم نے تو وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا (17:70)۔ کہا ہے کہ ''ہم نے انسان کو اپنی اکثر مخلوق پر فضیلت اور برتری عطا کی ہے۔'' کیا بات ہے قرآن کی!

موجودہ ہیئتِ انسانی کی فضیلت کے بعد کی رفعتیں اور وسعتیں

عزیزانِ من! یہ تو رہے یہاں کے طبعی قوانین اور اس طبعی کائنات میں انسان کا یہ درجہ۔کہا کہ انسان اسی طبعی جسم کا ہی نام نہیں ہے۔یہاں کی مخلوق میں تو اس کو ہم نے اکثریت پر افضلیت دیدی تو اب یہ افضلیت اسی اعتبار سے ہے کہ اس بنی آدم کو واجب التکریم بنایا اور پھر اکثر مخلوق پہ ہم نے اسے فضیلت دیدی تو کیا اب یہ سمجھ لے کہ بس پھر ہم جو جی میں آئے کریں ہماری یہ افضلیت اور شرف ومجد

Marfat.com

یہاں بھی اور اگلی زندگی میں بھی قائم رہے گا۔ کہا: یہ بات غلط ہے۔ یہ تو تمہاری طبعی زندگی کی گفتگو ہو رہی ہے۔ جہاں تک تمہاری انسانی زندگی کا تعلق ہے جس میں عمل سے جنت بھی اور جہنم بھی بنتی ہے تو اس میں تو تمہارے اعمال' جو تم نے انسان ہونے کی جہت سے کیے ہیں' کے مطابق جو درجہ بنتا ہے' ان کے مطابق اس شرف وجد کے مدارج کا تعین کیا جائے گا۔

عربی میں لفظ امام کا مفہوم اور عمل کی اہمیت

یَوْمَ نَدْعُوْا کُلَّ اُنَاسٍ بِاِمَامِهِمْ (17:70)۔ جب اعمال کے نتائج کے ظہور کے وقت ہر انسان کو اس کے اعمال نامے کے ساتھ بلایا جائے گا اور پوچھا جائے گا کہ اب کہاں ہے وہ تمہارا اعمال نامہ؟ یہاں کیا لفظ ہے "امام کا"!! امام تو وہ ہے جو آگے چلنے والا ہوتا ہے۔ ایک تو آپ کو یاد ہوگا کہ عرب "امام" کا لفظ کن معنوں میں استعمال کرتے تھے۔ میں کئی دفعہ بتا چکا ہوں' کہ جب معمار (Mason) دیوار بناتے ہیں تو وہ جو ان کے پاس "ساہل یا ساہول یا شاقول" (Plumb-Line) ہوتا ہے' وہ نیچے پتلی اور اوپر بڑا Simple سا تاگا ہوتا ہے۔ اسے ہم اوزار بھی نہیں کہہ سکتے۔ یہ ہوتا ہی کیا ہے؟ تاگا اور لٹو' لیکن دیوار کی صحت دیکھنے کے لیے کہ آیا وہ سیدھ میں جا رہی ہے یا کہ نہیں' اس کا سارا دارومدار اس کے اوپر ہے۔ اسی لیے آپ نے دیکھا ہوگا کہ اسے انہوں نے اوپر اینٹ سے باندھ کے لٹکا رکھا ہوتا ہے۔ اس میں ذرا سی ٹیڑھ آتی ہے' اس سے اسی وقت ان کو پتہ چل جاتا ہے اور وہیں ٹھیک کر لیتے ہیں۔ وہ "ساہل" یہ دیکھنے کا پیمانہ ہوتا ہے کہ دیوار سیدھی اٹھ رہی ہے یا نہیں۔ جماعت میں افراد کی حیثیت ان اینٹوں کی ہوتی ہے جو ایک دوسرے کے ساتھ مل کر گویا بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ (61:4) ہے' ایک ایسی دیوار جسے سیسہ پلا کر مستحکم کر دیا گیا ہو۔ قرآن نے اسی لیے اس جماعت کو سیسہ پلائی ہوئی دیوار کہا ہے۔ تو اس دیوار کا سیدھا ہونا نہایت ضروری ہے۔ اس جماعت کے ماپنے کا کہ آیا یہ جماعت سیدھی جا رہی ہے یا غلط رو ہے یہ "ساہل" ایک پیمانہ (Measure) ہے۔ وہ "ساہل" کیا ہے؟ جماعت کا یہ رہنما' اس کا یہ امیر' اس کا یہ مرکز' دراصل اس کا امام ہے' جس سے یہ ماپا جاتا ہے۔ آپ دیکھیے گا کہ اس کو سیدھا ہونا کتنا ضروری ہے۔ اگر اس لٹو (Top) میں ذرا سی ٹیڑھ آ جائے تو کوئی دیوار سیدھی اٹھ ہی نہیں سکتی۔

عزیزانِ من! اُن لوگوں کی بڑی اہمیت ہے جنہیں آپ رہنما کہتے ہیں۔ اسی جہت سے لفظِ امام ہے۔ اب تو ہمارے ہاں بس مسجد میں نماز پڑھانے والا صرف میاں جی ہوتا ہے' امام تو بڑی چیز ہے۔ ایک تو وہ اس قسم کا معیار (Standard) ہوتا ہے' پھر اسے آگے چلنا ہوتا ہے کہ وہ پیچھے سے آنے والوں کا راستہ متعین کرتا ہے۔ کہا کہ انسان کی اگلی زندگی کے اندر یہ راستہ متعین کرنے والی چیز کونسی ہوگی؟ اب یہ وہ انسان نہیں ہوگا جو یہاں امامت کرتا تھا' جو یہاں ان سب کُلَّ اُنَاسٍ (17:70) کی راہنمائی کرتا تھا۔ یہ کس چیز کے ساتھ امامت یا رہنمائی کرتا تھا؟ کہا: بِاِمَامِهِمْ (17:70)۔ ان کے "امام" کے ساتھ رہنمائی کرتا تھا۔ تو اب سوال یہ ہے کہ یہاں پر یہ "امام" کیا ہوگا؟

Marfat.com

انسان کا اعمال نامہ ہی اس کا امام ہوگا

قرآن نے ''اعمال نامہ'' کو بھی امام کہا ہے اور عجیب چیز ہے اس کی صاحب! اس نے کہا تھا: وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ (59:18)۔ ہر شخص کو یہ خیال رکھنا چاہیے کہ میں نے اپنے آنے والے کل (Tomorrow) کے لیے کیا کیا ہے۔ یہ جو آج (Today) انسان کرتا ہے' وہ اس کے اپنے مستقبل کے لیے ہے۔ اپنے کل کے لیے اسے دیکھنا چاہیے کہ وہ کام کل (Tomorrow) کو اسے کیا دیتا ہے۔ یہی آج کا کیا ہوا کل کو اس کا وہ امام بنتا ہے' اس کے لیے راستہ متعین کرتا ہے اور کہتا ہے کہ پیچھے پیچھے لگا آ' اگر وہ کام انسانیت سوز ہیں تو وہ جہنم کی طرف لیجانے کا راستہ متعین کرتے ہیں۔ اگر وہ کام انسانیت ساز ہیں تو وہ جنت کی طرف لیجانے کا راستہ متعین کرتے ہیں۔ تو یہ جو ''اس زندگی میں اس کے اعمال کے نتائج ہیں'' انہیں وہ امام کہتا ہے کیونکہ یہ آگے آگے چلتے ہیں اور ان کی کسی خاص متعین منزل کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ انہیں وہ اعمال نامہ کہا گیا ہے۔ دیکھا آپ نے کہ کس کس انداز سے قرآن بات کرتا چلا جاتا ہے۔

قرآن نے کہا کہ جب ہر انسان کو اس کے اعمال نامہ کے ساتھ آواز دی جائے گی۔ آپ دیکھتے ہیں ہر مقدمے میں اندر آواز پڑتی ہے تو اس کے ساتھ اعمال نامہ ہوتا ہے جس کے مطابق وہاں فیصلہ ہونا ہوتا ہے۔ آواز دیجائے گی۔ فَمَنْ اُوْتِیَ کِتٰبَهٗ بِیَمِیْنِهٖ فَاُولٰٓئِکَ یَقْرَءُوْنَ کِتٰبَهُمْ وَلَا یُظْلَمُوْنَ فَتِیْلًا (17:71)۔ جس کا اعمال نامہ اس کے دائیں ہاتھ میں ہوتا ہے (کہ یہ یمن سعادت کا نشان ہے) تو یہ لوگ اسے خوشی خوشی پڑھتے ہیں اور اس میں اپنے تمام اعمال کا پورا پورا بدلہ (Reward) موجود پاتے ہیں۔ اس میں ذرہ بھر بھی کمی نہیں ہوتی۔ بات سمجھانے کے لیے' قرآنِ کریم نے دایاں ہاتھ اور بایاں ہاتھ کہا ہے۔ یہ نہیں ہے کہ سچ مچ دائیں ہاتھ میں کچھ کاغذ دیدیئے جائیں گے۔ عام طور پر دنیا کی ہر زبان میں ''یمن'' دائیں ہاتھ کو کہتے ہیں' اسے ''سعادت کا یمنہ'' بھی کہتے ہیں۔ انسان زیادہ کام اسی سے کرتا ہے۔ ویسے یہ دائیں اور بائیں کا فرق کچھ فرق نہیں ہے۔ طبعی طور پر ہمارے ہاں کھبچو (بائیں ہاتھ سے کام کرنے والے: (Left-handed) بھی تو ہوتے ہیں اور اگر ایسا نہ ہو' بچپن ہی سے بچے کو دونوں ہاتھوں سے کام کرنے کی عادت ڈال دی جائے تو دونوں ہاتھوں سے یکساں طور پر بھی کام کیے جاتے ہیں لیکن زبان کے اعتبار سے اور پھر قرآن تو عربوں کی زبان میں نازل ہوا ہے' ان کے ہاں بھی دایاں ہاتھ یمین کہلاتا تھا کیونکہ یمن برکت یا سعادت کو کہتے ہیں۔ تو یہ ہوا برکت اور سعادت والا ہاتھ یعنی وہ بابرکت اور باسعادت انسان ہوگا جس کا اعمال نامہ اس کے اس ہاتھ میں ہوگا' یوں کہ دیجیے۔ یہ ہیں وہ لوگ جو سعادت بخش اور سعادت مند ہوں گے۔ وَلَا یُظْلَمُوْنَ فَتِیْلًا (17:71)۔ وہاں کسی سے کسی قسم کی زیادتی نہیں کی جائے گی۔ ذرہ برابر بھی کسی سے زیادتی نہیں ہوگی' کسی کے عمل کے اندر کمی نہیں ہوگی' کسی کے خلاف زیادتی نہیں ہوگی۔ وہ اَصْحٰبُ یَمِیْنٍ (56:27) ہونگے۔ وہ یوں کہہ دیجیے کہ وہ یمن و سعادت کے مالک ہونگے۔ مگر یہ بات تو وہاں کی ہو رہی ہے۔

Marfat.com

سوال یہ پیدا ہوا کہ کوئی ایسا طریقہ بھی ہے جو یہاں معلوم ہو جائے' پہلے ہی معلوم ہو جائے' دنیا میں ہی معلوم ہو جائے کہ وہاں یمن و سعادت والے کون ہونگے؟ وہاں کامیاب کون ہونگے؟ یہ بڑی بات ہے' ورنہ یہاں تو یہی کہا گیا ہے کہ یہ بونے (Sow) کی چیز ہے' یہاں اس کھیتی میں پھل' کس قسم کا آئے گا' وہاں جا کے پتہ چلے گا۔ ہوسکتا ہے کہ جسے تم یہاں انگور کی بیلیں کہو' ''اوتھے ترکونے انی لگے ہون۔''[1] کیا یہاں بھی معلوم ہوسکتا ہے؟ جی ہاں معلوم ہوسکتا ہے: یہاں ''حضرت صاحب'' نے معیار مقرر کیا ہوا ہے اور وہ معیار ہے: بھوکا' ننگا' مفلس اور مفلوج ہونا' جسے دنیا اپنے پاس نہ آنے دے۔

قرآن ہے عزیزانِ من! یہاں ''اعمیٰ'' ہونا کے کیا معنی ہیں؟ اس کے معنی ہیں یہاں اندھا ہونا۔ دیکھیے قرآن کیسے وضاحت کرتا چلا جاتا ہے۔ کہا: وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِىْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا (20:124)۔ جو ہمارے قوانین سے اعراض برتتا ہے ہم اس کی معیشت (Economy) تنگ کر دیتے ہیں' یہاں اس کی روٹی تنگ کر دیتے ہیں۔ مَعِيْشَةً ضَنْكًا (20:124)۔ یہاں اکانومی Economy کا ترجمہ ہی معیشت کیا جاتا ہے۔ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِىْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا (20:124)۔ ہمارے قوانین سے اعراض برتنے کا نتیجہ یہ ہے کہ جہاں وہ قوم روٹی کے لیے بھی محتاج ہو جاتی ہے۔ وَنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى (20:124)۔ اور اسے پھر قیامت کے دن بھی اندھا ہی اٹھایا جاتا ہے۔ اب آ گئے اندھے کے معنی کہ جسے کہا تھا۔ وَمَنْ كَانَ فِىْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى (17:72)۔ اس کے معنی کیا ہو گئے؟ کہا: اندھا وہ ہوا جو مَعِيْشَةً ضَنْكًا (20:124) ہوگا' جس کی معیشت تنگ ہوتی ہے۔ جس کی معیشت (روزی) تنگ ہوتی ہے وہ یہاں کا اعمیٰ ہوتا ہے اور جو یہاں کا اعمیٰ ہے' وہ وہاں کا بھی اعمیٰ ہوگا۔ جسے رَبَّنَآ اٰتِنَا فِى الدُّنْيَا حَسَنَةً (2:201)۔ (اے ہمارے نشوونما دینے والے! ہمیں دنیاوی زندگی کی خوشگواریاں حاصل ہوں) کی قبولیتِ دعا حاصل نہیں ہے' اسے فِى الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً (2:201)۔ (اُخروی زندگی کی خوشگواریاں بھی) کیسے مل سکیں گی؟ زندگی تو جوئے رواں است و رواں خواہد بود۔ کیا یہاں کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آپ کے اوپر والے پل کے اوپر تو پانی ہو لیکن نہر میں کچھ بھی نہ ہو' اور اگر آپ ذرا نیاز بیگ[1] میں جائیں تو وہاں وہ نہر لبالب بھری ہوئی چلی جا رہی ہو۔ اس میں پانی' وہاں اپنے منبع سے لے کے آخر تک' رواں جانا چاہیے۔ یہ ہے قرآن کا بتایا ہوا معیار۔

قرآن کے نزدیک قوموں کا باہمی فرق

اب قرآن نے دوسرے مقامات پہ خود ہی تین قسم کی قوموں کا فرق کر دیا ہے: ایک تو وہ قومیں ہیں جنہوں نے صرف فطرت کے قوانین (Laws of Nature) کو مسخر (Harness) کیا تو طبعی زندگی (Physical Life) کی ساری آسائشیں (Comforts) خوشگواریاں (Happy Tidings) اور مادی ترقیاں (Material Gains) حاصل کر لیں۔ قرآن نے کہا ہے کہ اس بات میں مومن اور کافر میں کوئی تمیز نہیں ہے۔ یہ طبعی قوانین ہیں جو قوم بھی طبعی قوانین کے تابع محنت کرے گی' اس کو اس کے پھل

[1] شہر لاہور میں ایک جگہ کا نام ہے۔

Marfat.com

مل جائیں گے صاحب! كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ هٰٓؤُلَآءِ (17:20) یہ اگر مومن ہے تو بھی ہم اس کی مدد کرتے جاتے ہیں اور جنہیں ہم تم کافر کہتے ہیں اس کی بھی مدد ہوتی جاتی ہے۔ جو قانون کے مطابق ہل چلاتا ہے' کھیتی کرتا ہے' اس کھیتی کی حفاظت کرتا ہے' وہ ہرنام سنگھ کا کھیت ہو یا عبدالرحمٰن کا کھیت ہو' اس میں ہمارے قانون کے مطابق فصل اگتی ہے۔

انسانیت سے متعلق قوانینِ خداوندی کے انکار کا نتیجہ

اس طرح اقوام عالم میں ایک اقوام تو وہ ہوگئیں جنہوں نے یہ خوشگواریاں حاصل کیں۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ اگر انہوں نے انسانیت سے متعلق جو قوانینِ خداوندی تھے' ان کا انکار کیا' تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ان خوشگواریوں کے باوجود' یہاں بھی ان کی معاشرتی زندگی جہنم کی زندگی ہو جائے گی' انہیں امن وسکون نہیں مل سکے گا' اطمینان حاصل نہیں ہو سکے گا' اضطراب کی آگ ہوگی جو ان کے سینوں میں بھڑک رہی ہوگی' اگرچہ ان کو مادی خوشگواریاں ضرور نصیب ہونگی۔ یہ ٹھیک ہے۔ مگر یہ وہ اقوام ہیں کہ پھر جن کا آخرت کی خوشگواریوں میں کوئی حصہ نہیں ہو سکتا۔ قرآن میں یہ ہے کہ یہ لوگ وہاں جا کے کہیں گے کہ صاحب! یہاں سے کچھ تو ملنا چاہیے' وہاں ہم نے کچھ تو نیکی کے کام کیے تھے' کچھ اچھے کام کیے تھے۔ قرآن کہتا ہے: ان سے کہا جائے گا کہ وہ طیباتِ دنیا کا جو حصہ تھا' وہ حصہ تو تم نے وہیں لے لیا تھا۔ ہم تم پہ ظلم نہیں کر رہے۔ یہ تو یہی ہے کہ تم نے کہا تھا کہ یہیں دے دیجیے' ہم نے یہیں دیدیا' اب یہاں تمہارا حصہ دوبارہ نہیں آئے گا۔ تو ایک تو ہوگئی یہ قوم: یہاں مالی لحاظ سے خوشحال' مگر آخرت میں تباہ حال۔

دوسری قسم کی قوم

ایک دوسری قسم کی قوم ہوگی' جس نے یہاں' ان طبعی قوتوں کو' یہاں کے طبعی سامان کو' مسخر کیا۔ انہیں یہاں کی زندگی کی ساری خوشگواریاں میسر ہوئیں اور انسانیت سے متعلق قوانینِ خداوندی کا بھی اتباع کیا تو یہاں کی زندگی بھی جنت کی زندگی ہوگئی' کل کا' Tomorow کا' بھی اطمینان ہوا۔ ساتھ ہی اشرفِ انسانیت بھی حاصل ہوا۔ یہ وہ قوم ہے کہ جب آگے چلے گی تو پھر مستقبل میں بھی اسے خوشگواریاں ملیں گے۔ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً (2:201)۔ انہیں دنیاوی زندگی کی خوشگواریاں بھی حاصل ہوں گی اور اُخروی زندگی کی خوشگواریاں بھی۔

تیسرے درجے کی قوم

تیسرا درجہ ان اقوام کا ہے کہ جنہوں نے یہاں بھی فطرت کے قوانین کی اتباع واطاعت نہ کی تو یہاں کی خوشگواریوں سے بھی محروم رہ گئے۔ جب یہاں کی خوشگواریوں سے محروم رہے تو قرآن نے یہی فیصلہ کر دیا کہ یہ اقوام اپنے متعلق ابھی سے سمجھ لیں۔ فَلَا نُقِیْمُ لَهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَزْنًا (18:105)۔ ظہورِ نتائج کے وقت ان کے اعمال کا وزن معلوم کرنے کے لیے ترازو کھڑا کرنے کی بھی ضرورت نہ پڑے جس کے تحت آخرت میں ان کا کوئی حصہ ہی نہیں ہوگا۔ وہ اپنی بے مائیگی کی شہادت آپ ہوں گے۔ اس لیے کہ

Marfat.com

مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى (17:72) جس کی مَعِيْشَةً ضَنْكًا (20:124) معیشت کی تنگی (Economic Morass) اس دنیا کے اندر ہوگی' آخرت میں اس کا حصہ نہیں ہوسکتا۔ یہ اقوام کی تیسری کیٹگری (Category) ہوگئی۔

ان تین اقسام کی مزید وضاحت

پہلی کیٹگری (Category) میں تو آپ اقوامِ یورپ کو رکھ لیجیے۔ یہ وہ اقوام ہیں' جو آج کی دنیا میں دنیاوی ترقیاں حاصل کرتی ہیں۔ دوسری کیٹگری میں وہ اقوام ہیں جن کی یہ زندگی بھی شادمان جس میں ترقیوں اور خوشگواریوں کا دور دورہ' اور پھر آخرت میں مومن کی زندگی یعنی جماعتِ مومنین کی وہ زندگی' وہ عزوشرف' جو ہمیں صدرِ اول کی تاریخ میں نظر آتا ہے۔ اور اس کے بعد تیسری کیٹگری میں وہ اقوام جو یہاں بھی ذلیل وخوار' لہٰذا وہاں بھی ذلیل وخوار۔ اب اس دنیا میں ان کا نام سوائے اس نام کے اور کوئی نہیں ہے یعنی مسلمان رکھ لیا جائے' اور کیا کہا جائے! کوئی دوسری قوم تو اس کیٹگری میں اب نظر نہیں آتی۔ کل تک یہ کچھ یہودیوں کے متعلق کہا جاتا تھا کہ بہت ذلیل وخوار تھے۔ قرآن نے بھی کہا تھا لیکن انہوں نے بھی جب اس کے قوانینِ طبعی کی اطاعت کی۔ حَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ (3:102) یا حَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ (3:111)۔ بڑی بڑی طاقتوں کے سہارے بھی ڈھونڈ لیے تو پھر انہیں بھی کچھ مل گیا ہے۔

دنیا بھر کا مسلمان یہودیوں کے شکنجے میں

عزیزانِ من! وہ جنہیں آج بھی ہم اپنے ہاں غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ (1:7)۔ کی تفسیر میں محراب ومنبر سے یہ کہتے ہیں کہ مغضوب علیھم سے مراد یہودی ہیں اور کیفیت یہ ہے کہ وہ آپ کے قلبِ اسلام کے اندر اتنا سا ٹکڑا ہے' وہ بھی آپ لوگوں سے چھینا ہوا ہے۔ وہاں کی مسلمان آبادی کو دھتکار کے باہر پھینکا ہوا ہے اور یہ غریب فلسطینی مہاجر اتنے عرصے سے باہر' انہیں کے ساتھ' اسی سرزمین کے اوپر جھونپڑیوں کے اندر رہ رہے ہیں جبکہ یہودیوں نے ان کے اندر اپنے آپ کو Establish کیا ہے۔ آج اگر زیادہ نہیں تو دنیا میں کوئی ساٹھ ستر کروڑ مسلمان بتائے ہی جاتے ہیں۔ [1] دنیا میں اور زیادہ پھیلے ہوئے تو چھوڑیئے' پندرہ بیس پچیس کروڑ تو انہی ممالک کے اندر وہ سارے مسلمان ہیں۔ تیس سال سے یہ سارے ساٹھ ستر کروڑ [2] ''ٹلاں لا کے مرگئے ہیگے نیں۔'' [3] لیکن اس کے باوجود ان مغضوب علیہ یہودیوں کو وہاں سے نکال نہیں سکے۔ ان کے اندر انہیں ذرا سی جنبش دینے کی طاقت بھی نہیں رہی۔ یہ اور محکم ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں یہ مسلمان کیا کرتے ہیں: حج کی تقریب میں جاتے ہیں' بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ امسال بفضلہٖ تعالیٰ چودہ لاکھ کے قریب حاجی ہیں۔ [4] بہت اچھا جی پھر کیا کیا؟ جب جبلِ رحمت میں پہنچے اور حج قبول ہوا' وہاں پہ

---

[1] اس وقت یہ تعداد ایک ارب سے بھی زیادہ کی ہے۔
[2] اب ایک ارب سے بھی زیادہ
[3] انتہائی کوشش کے باوجود ناکام رہے ہیں۔
[4] اس وقت تقریباً 30 لاکھ کی تعداد میں ہیں۔

Marfat.com

چودہ لاکھ نے دعائیں مانگیں کہ یا اللہ! ان اسرائیلوں کی حکومت کو تباہ کر دے۔ تیس سال سے دس بارہ چودہ لاکھ تو وہاں مسلمان اور ان کے اتباع میں ہر مسجد کے اندر یہی دعائیں۔ ہوا آج تک بھی کچھ نہیں۔

مسجد اقصٰی کے جلا دینے کا اقصٰی ڈے

اب تو تین چار سال سے' جب سے انہوں نے مسجدِ اقصٰی جلائی ہے' اقصٰی ڈے (Day) منایا جا رہا ہے۔ ابھی پچھلے ہی ہفتے اقصٰی ڈے منایا ہے۔ یہ جو کچھ ہو رہا ہے' اسے دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ قوم کس قدر خود فریب ہو جاتی ہے' جو سعی و عمل سے بے گانہ ہو کر صرف رسومات کی ادائیگی میں لگی رہتی ہے۔ آپ دیکھیں کہ انہوں نے مسجدِ اقصٰی کو جلایا ہے۔ اس جلانے کے بعد بھی ان کے لیے اتنی ہی تدبیر باقی ہے کہ اس کا ڈے (Day) منا لیا کریں۔ وہ یہودی بھی کچھ عرصہ یہی کیا کرتے تھے' سال میں ایک ڈے منایا کرتے تھے۔ آپ نے یہ جملے سنے ہوں گے: ''بیت المقدس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی' اس کا نام و نشان مٹ گیا تھا۔ یونہی کوئی ایک دیوار کی چند اینٹیں کھڑی رہ گئی تھیں' وہ بھی کوڑے کرکٹ میں دبی ہوئی تھی۔'' یہودیوں نے جس زمانے میں مسلمانوں پہ قبضہ کیا تو عیسائی مسلمانوں کے تابع تھے۔ وہ انہیں وہاں نہیں آنے دیتے تھے۔ انہوں نے تباہ کیا تھا۔ عیسائیوں نے ہی تو مسلمانوں کی مملکت سے درخواست کی کہ یہ جو ذرا سی دیوار بچی ہوئی ہے' اسے صاف کر دیجیے۔ اور یہودیوں نے کہا تھا کہ ہمیں اجازت دیجیے کہ ہم سال میں ایک دفعہ اسے آ کے دیکھ جایا کریں۔ انہوں نے کہا: ٹھیک ہے' آ جایا کرو۔ تو سال کے بعد وہ وہاں جاتے تھے۔ اس دیوار کا نام ''دیوارِ گریہ'' (Wailing Wall) تھا۔ وہ وہاں جاتے تھے اور دہائی دیدے کے رویا کرتے تھے کہ ''پھر سے یروشلم بن جائے۔ اے دیوار' تو پھر سے اپنے خدا کے نام پہ وہ مقدس ہیکل بن جا۔'' اور پتہ نہیں کس کس کے نام پہ وہ دہائی دے کر رویا کرتے تھے اور دعا مانگا کرتے تھے۔ یہ سب ویسے ہی تھا جیسا کچھ ہم حج کے اندر دعا مانگتے ہیں۔ مانگتے چلے گئے۔ یہ روتے رہے' دعائیں مانگتے چلے گئے۔ دیوار اتنی کی اتنی ہی رہی' نہ وہ دیوار مٹی' نہ بڑھی۔ جب انہوں نے وہ طریق اختیار کیا جو فطرت کے قوانین کے مطابق تھا' آج اس کا نتیجہ آپ کے سامنے موجود ہے۔

خود فریبی کی انتہا

آپ نے پھر وہی ''دیوارِ گریہ'' (Wailing Wall) کی طرح اپنے ہاں اقصٰی ڈے رکھ لیا۔ آپ اسے ایک دن منا لیتے ہیں اور پھر سارے کے سارے روتے ہیں۔ بڑی بڑی دعائیں ہوتی ہیں کہ صاحب! دیکھیے' یا اللہ! ان کو ذلیل کر' جنہوں نے تمہارے دین کو' دینِ محمد ﷺ کو ذلیل کیا: اور اس کے بعد' خود فریبی ہے' عمل سے تہی دامنی ہے۔ عزیزانِ من! وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللّٰهَ (59:19)۔ دیکھنا' ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے خدا کو بھلا دیا۔ یعنی قوانینِ خداوندی کو پسِ پشت ڈال دیا تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ فَأَنسَاهُمْ أَنفُسَهُمْ (59:19)۔ ''خود ان کی ذات ہی ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی' اس طرح وہ

قوم خودفریبی میں مبتلا ہوگئی۔ یہ صحیح ترجمہ ہے عزیزانِ من! آپ سیلف ریسرچ Self Research کریں' یہ تو آپ کو معلوم ہوگا کہ مذہب پرست قومیں مذہب میں جتنی شدید ہوتی چلی جاتی ہیں' اتنا ہی زیادہ خودفریب ہوتی چلی جاتی ہیں۔ عزیزانِ من! وہ اعمال کے محسوس نتائج مانتی ہی نہیں' وہ ان محسوس نتائج کو ماپتی ہی نہیں۔ مذہب پرست طبقے کی طرف سے انہیں فریب میں رکھا جاتا ہے۔ ان کا اعمالنامہ مرتب ہو رہا ہے۔ اعمال نامے میں لکھا جا رہا ہے: ''ہوتے چلے جاؤ یہاں ذلیل۔ یہاں کا جتنا ذلیل ہوگا' وہاں اتنا ہی زیادہ مقربِ الٰہی ہوگا۔''

کتنی بڑی ہے یہ خودفریبی عزیزانِ من! مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِيْلًا (17:72)۔ ''جو کوئی اس دنیا میں اندھا ہے' وہ آخرت میں بھی اندھا ہی ہوگا۔'' یہ خدا کا بتایا ہوا معیار ہے عزیزانِ من! یہ میرا یا آپ کا کہا ہوا نہیں ہے۔ اسے پھر دہرا دوں کہ مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِيْلًا (17:72)۔ جو اس دنیا میں اندھا ہے' وہ آخرت میں بھی اندھا ہی ہوگا۔ وہاں اس سے بھی زیادہ بدتر حالت ہوگی اس لیے کہ وہاں کی تو خوشگولیاں بھی یہاں کے مقابلے میں بہت ہی زیادہ خوشگوار اور وہاں کی تباہیاں بھی یہاں کے مقابلے میں بہت زیادہ تباہ کن ہوں گی۔ اس لیے وَاَضَلُّ سَبِيْلًا (17:72)۔ وہ جو یہاں کا ذلیل ہوگا' یہاں سے بھی زیادہ گیا گذرا ہوگا۔ اس سے نکلنے کا طریقہ وہی خالص خداوندی قوانین پر اعتماد ہے۔ وَكَفٰى بِرَبِّكَ وَكِيْلًا (17:65)۔ یہ ان قوانینِ خداوندی پر بھروسہ کریں گے تو وہ انہیں کبھی دغا نہیں دیں گے۔

قانونِ خداوندی کے اندر مصالحت کا' لچک کا' مفاہمت کا' نتیجہ

اس بات کا یقینِ محکم ہے کہ سب کچھ قوانینِ خداوندی سے حاصل ہوتا ہے اور یہ قوانین بڑے ہی قابلِ اعتماد ہیں۔ اب جب کسی قانون کے اتنے زیادہ قابلِ اعتماد ہونے پر آپ کا ایمان ہو جائے تو پھر اس قانون کے متعلق کسی سے مصالحت' مفاہمت (Compromise)' لچک' پیدا کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آپ نے اس میں ذرا سی مفاہمت کی' سارا نقشہ ہی بگڑ گیا۔ تمہاری سمجھ میں تو یہ بات آ ہی نہیں سکتی۔ یہ پوچھیے امریکہ کی لیبارٹری والوں سے' جو ان لوگوں کو چاند پہ بھیجتے ہیں۔ وہ اگر اپنے اُس قاعدے میں' جو خدا کے قانون کے مطابق ہے' کہیں بھی کسی اور قاعدے' قانون' اصول' کے ساتھ Compromise کر لیں' ذرا سی مفاہمت کر لیں کہ ''اچھا کوئی بات نہیں۔ یہاں تک تو وہ بات اس قاعدے کے مطابق چل رہی ہے' اچھا بھئی' ناراض کیوں ہوتے ہو؟'' ''بتاؤ؟ کیا کہتے ہو؟ میں چاہتا ہوں: ''تین نہیں وہاں ساڑھے تین ہونا چاہیے صاحب!'' او بھئی! تین۔ میں کہتا ہوں: نہیں صاحب! ''ٹھیک ہے بھئی! وہ جو تم Calculation کر رہے ہو' میاں صاحب ناراض ہو رہے ہیں اور جا رہے ہیں۔ اتنی سی بات میں فرق بھی کیا پڑے گا: تین نہیں اس کے ساتھ Compromise کرو۔ ساڑھے تین سہی۔ اس کو کہو: وہاں ساڑھے تین لکھا کرے''۔ تو پھر پوچھو: یہ چاند پہ جانے والے کہاں پہنچتے ہیں۔ جب تک قانون Uncompromiseable نہیں ہوگا' قانون نہیں کہلائے گا۔ آپ نے اس میں ذرا سا بھی

Compromise کیا' مفاہمت کی' وہ قانون گیا۔ جہاز کی جس لائن تک پانی رکھنے کا کہا ہے' اگر پانی وہاں تک ہے تو یہ جہاز پانی کے اندر تیرے گا۔ اگر آپ اسے ایک انچ بھی زیادہ لے گئے' تو وہ جہاز پانی میں ڈوب جائے گا۔ اسے توکل کہتے ہیں۔ اس میں ذرا سا بھی Compromise نہیں ہوسکتا۔

دین نام ہی اس چیز کا ہے یعنی خدا کی Uncompromiseable چیز۔ اگر سورج نکل رہا ہو اور اسے کہا جائے کہ ''او خدا کا نام مان' آج نیند پوری نہیں ہوئی ذرا پانچ منٹ ٹھہر کے یا ذرا دس منٹ ٹھہر کے نکلنا۔'' وہ سنتا ہی نہیں ہے۔ اور اگر آپ صبح چار بجے اٹھ کے بیٹھ جائیں تو کیا وہ آپ کی خاطر صبح آجائے گا کہ جی اچھا! آپ جاگ اٹھے' میں بھی آجاتا ہوں ۔ دینِ خداوندی Uncompromiseable ہوتا ہے' ناقابلِ مفاہمت ہوتا ہے۔ وَاِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا غَيْرَهٗ وَاِذًا لَّاتَّخَذُوْكَ خَلِيْلًا (17:73) ۔ان کی کوشش یہ ہے کہ کچھ تھوڑی سی مفاہمت کرلے۔ ذرا ان کے ساتھ کچھ Compromise کرلے اور پھر وہ تمہارے دوست بن جائیں گے۔ وہ جانتے تھے کہ جن اصولوں پہ یہ چل رہا ہے' اگر ان میں کسی طرح ذرا سی بھی لچک پیدا کرادی جائے تو پھر یہ یوں گیا۔ یہ پہلے ٹکراؤ کی کوشش تھی۔ اس میں ناکامی ہوئی تو پھر Compromise کی کوشش شروع ہوتی ہے' مفاہمت کی صورت شروع ہوتی ہے۔ یہی کچھ تو پاکستان میں بھی ہوا۔ دین کے نام پہ فریب دیا گیا۔

پاکستان میں دین کے نام پر فریب دہی

قرآنِ کریم میں مختلف مقامات پہ یہ چیز کہی گئی ہے۔ اسے آپ آج کی اصطلاح میں میکاوَلی سیاست (Machiavellian Politics) کہتے ہیں۔ یہ میکاوَلی حکمت عملی (Machiavellian Strategy) کہلاتی ہے' اسے سیاسی ضروریات کا تقاضا کہتے ہیں۔ دراصل سیاست میں یہ ڈپلومیسی میکاوَلی (Machiavelli:1469-1527) کی حکمتِ عملی تھی۔ جب دین میں یہ چیز آجائے تو آپ کو معلوم ہے کہ مجھے یہ بار بار کہنا پڑتا ہے کہ پاکستان میں دین کے راستے سے ہٹ کر فریب دہی آئی تو اس نے اسے تباہ کردیا۔ خالص سیکولرزم بھی ایک چیز ہوتی ہے۔ اگر یہی آتی تو اس سے کم از کم زندگی کی طبعی خوشگواریاں تو مل جاتیں۔ دین کے نام پہ جو فریب دہی کی چیزیں آکر اسے تباہ کررہی ہیں' ان کے لیے مجھے پھر وہی مثال دینا پڑتی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ 1956ء میں جماعتِ اسلامی کے اکابرین کی ایک جماعت اس سے الگ ہوئی۔ یہ نیچے کے طالبعلم نہیں تھے' ان کے ہاں کے اکابرین تھے۔ مولانا امین احسن اصلاحی صاحب بھی تھے' جو امیرِ جماعتِ اسلامی رہ چکے ہوئے تھے۔ جب وہ الگ ہوئے ہیں تو ان کی Statements چھپ گئیں' رسالے چھپے' کتابیں چھپیں' تو پتہ چلا کہ ان کے ساتھ کیا جھگڑا ہوتا رہا ہے۔

Marfat.com

اصول پرستی کے مقابلے میں حکمت عملی

انہوں نے مودودی صاحب کو Accuse کیا تھا کہ آپ نے جب یہ جماعت بنائی تھی تو اس زمانے میں آپ نے ہمیں کچھ اصول دیئے تھے اور کہا تھا کہ یہ دین کے اصول ہیں' جو اٹل ہیں' ان کے مطابق چلنا ہے۔ ہم اس لیے ساتھ ہوئے تھے۔ یہاں آنے کے بعد ہم دیکھ رہے ہیں کہ جب آپ اقتدار کے پیچھے جا رہے ہیں' اسے حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں تو آپ ان اصولوں کو چھوڑ رہے ہیں۔ اس لیے ہم یہ ساتھ نہیں دیتے۔ ان کا جواب موجود ہے۔ آج تک یہ اسی مشہور جواب پہ چلے آ رہے ہیں کہ "صاحب! یہ اصول اپنی جگہ پہ ٹھیک ہیں لیکن حکمتِ عملی بھی تو ایک چیز ہوتی ہے۔ اصول آج بھی وہی اصول ہیں لیکن یہاں کی سیاست کے جو تقاضے ہیں' ان کی رُو سے یہ ضروری ہو گیا ہے کہ ہم ان اصولوں کے اندر کچھ لچک پیدا کریں"۔ یہ حکمتِ عملی کہلاتی ہے۔

نبی اکرم ﷺ پر بہتان (معاذ اللہ)

اگر یہیں تک یہ کچھ ہوتا تو ان کی سیاست ہوتی لیکن ہماری بدبختی' ہماری بدقسمتی' یہ ہے کہ یہ لوگ جو کچھ اپنی حکمتِ عملی کے طور پر' اپنے مفاد و تقاضوں کے لیے کرتے ہیں' جھٹ سے یہ اس ذاتِ اقدس و اعظم ﷺ کی طرف منسوب کر دیتے ہیں کہ جن کے متعلق قرآن یہ کہہ رہا ہے کہ انہوں نے سب قسم کی تکلیفیں برداشت کیں مگر اپنے اصولوں میں ذرا سی لچک نہیں پیدا ہونے دی۔ یہ کہتے یہ ہیں کہ تم دیکھتے نہیں ہو۔ معاذ اللہ معاذ اللہ۔ کہ رسول اللہؐ اپنی مکی زندگی کے اندر' مذہبی زندگی میں مساواتِ انسانیہ کا اصول پیش کرتے چلے آئے' جب مملکت بن گئی تو آپ نے یہ کہہ دیا کہ یہ مملکت الحکم من قریش ہے۔ یہ مملکت میرے خاندان کے اندر رہے گی' قریشیوں کے اندر رہے گی۔ کہاں گیا مساواتِ محمدی کا اصول جسے حضورؐ تیرہ برس مکے میں قائم کرتے چلے آ رہے تھے؟ یہ جواب دیا گیا ہے عزیزانِ من! پھانسی دیدو اس پرویز[1] کو کہ یہ منکرِ حدیث ہے۔ اپنی اس روش کو جائز ثابت کرنے کے لیے' بازی بازی باریش' او سو چو تو سہی' کس مقام پہ' کس ہستی پہ' ہاتھ ڈال رہے ہو۔ اس کا مقام جبریل سے بھی اونچا ہے۔ کہہ رہے ہو کہ اس صلعم نے بھی اصولوں کو چھوڑ کے حکمت عملی اختیار کر لی تھی۔ قرآن کہتا ہے کہ انہوں نے یہ تہیہ کر لیا تھا' یہ سازشیں کر لی تھیں کہ کسی طرح سے تو اپنے اصولوں کے اندر ذرا سی لچک پیدا کر لے۔ ان کے سامنے تھوڑی سی مفاہمت اور Compromise کر لے۔ وَاِذًا لَّاتَّخَذُوْكَ خَلِيْلًا (17:72)۔ تو یہ تمہارے دوست بن جائیں گے۔

قرآن بار بار کہتا چلا آ رہا ہے عزیزانِ من! سنتے رہو یہ دو چار آیتیں۔ یہ بڑی اہم چیزیں ہیں۔ اصولوں میں بالکل لچک نہیں ہوتی۔ یہاں کسی قانون کے اندر تھوڑی سی لچک پیدا کر کے اس کا تماشا دیکھ لیجیے کہ کیا بنتا ہے۔ پھر اس کے بعد اس کے کیا نتائج نکلتے ہیں۔

---

[1] جی۔ اے۔ پرویز (۹ جولائی ۱۹۰۳ء تا ۲۶ فروری ۱۹۸۵ء)

Marfat.com

وَاِذَا تُتْلٰی عَلَیْهِمْ اٰیَاتُنَا بَیِّنٰتٍ قَالَ الَّذِیْنَ لَایَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَیْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ (10:15)۔ تُو ان کے سامنے قرآن پیش کرتا ہے تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ بھئی! بات یہ ہے کہ آؤ! بیٹھ کے بات کرلیں۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ یہ قرآن جو تم Constitution کے طور پہ دیتے ہو' ہمیں Acceptable نہیں ہے۔ اس کو چھوڑ دو اور آؤ مل جل کر اسے ایک بنالیں یا جیسا ہم کہتے ہیں' اس میں کچھ تبدیلیاں پیدا کردو' کچھ Compromise کی صورت پیدا ہونی چاہیے۔ قُلْ (10:15)۔ ان سے کہدو کہ سربراہِ مملکت تو میں ہوں۔ تمہارے آج کے انداز کے مطابق مجھے Sovereignty حاصل ہے' میرے اوپر کسی کا اقتدار نہیں۔ تمہارے ذہن میں یہی ہوگا کہ میں جیسے جی چاہے کرسکوں گا۔ آپ دیکھتے ہیں کہ Constitution میں تبدیلیاں ہوتی جارہی ہیں۔ اندرا گاندھی کیا کررہی ہے؟ یہی کہ وہ آئین میں تبدیلیاں کررہی ہے اور یہی ڈیموکریسی ہے۔ جمہوریت کا یہ قاعدہ ہے کہ آپ اپنے ہاں اکثریت لے آیئے۔ آئین میں جی چاہے' جب جی چاہے' ترمیم کرلیجیے صاحب! وہ غیر آئینی ہوتا ہی نہیں ہے۔ یہ ہے یہاں کا میکاولی نظام (Machiavellian System)۔ یہ کیوں ہے؟ یہ اس لیے کہ وہ Constitution بھی ان کا اپنا ہی بنایا ہوا ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں: وہ ہمارا بنایا ہوا ہے اس لیے ہم مجاز ہیں' جب جی چاہے' اس میں ترمیم کرلیں۔ بات بڑی ٹھیک ہے' یہ عین جمہوریت ہے۔ اس کا جواب بھی یہی ہے' اور دنیا میں کوئی بھی اٹھ کے یہ نہیں کہتا کہ نہیں' یہ Undemocratic ہے۔ یہ جمہوریت ہے۔ ترمیم کا بل (Bill) پارلیمنٹ میں پیش کیا' اکثریت نے وہاں منظور کرلیا۔ کیوں کردیا؟ اس لیے کہ یہ انہی کا بنایا ہوا تھا' وہ اس میں ترمیم کرسکتے تھے۔

میں کون ہوں کہ جو خدا کے قانون میں کوئی تبدیلی کروں

عزیزانِ من! دیکھیے' قرآن کہاں بات کرتا ہے! قرآن کہتا ہے کہ ان سے کہو: قُلْ مَا یَکُوْنُ لِیْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِیْ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ (10:15)۔ میں اس میں تبدیلی تو اس صورت میں کروں' جب یہ میرا اپنا بنایا ہوا ہو۔ یہ تو میرا بنایا ہوا ہی نہیں ہے۔ یہاں تو Constitution ہی خدا کا دیا ہوا ہے اور اس سلسلہ میں مجھے Sovereignty حاصل ہی نہیں ہے۔ مجھے تو یہ دیا گیا ہے کہ اس Constitution (آئین) کے مطابق کام کرو۔ میں خود اس کا اتباع کرتا ہوں۔ جب یہ میرا بنایا ہوا نہیں ہے' میں اس میں کیسے تبدیلی کرسکتا ہوں۔ انہوں نے کہا ہوگا کہ ذرا سی لچک پیدا کرلو۔ کہا: اِنِّیْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ (6:15)۔ اگر میں اس میں ذرا سی بھی مفاہمت اور لچک کروں تو خدا کے اس عذاب سے ڈرتا ہوں کہ جو بڑا سخت ہوتا ہے۔ سنتے ہیں جواب! فرق یہ ہے عزیزانِ من! کہتے ہیں کہ نظریۂ پاکستان کیا ہے؟ جس کو اسلامی حکومت کہتے ہیں یہ کس طرح سے سیکولرز سے منفرد ہے؟

Marfat.com

اسلامی حکومت کا آئین انسانوں کا بنایا ہوا نہیں ہوتا

ایک لفظ کا جواب ہے عزیزانِ من! کہ اسلامی حکومت کا Constitution (آئین) انسانوں کا بنایا ہوا نہیں ہوتا۔ یہ انہیں خدا کی طرف سے بنا بنایا ملتا ہے۔ اس لیے یہ تو ایک پارٹی کی اکثریت ہے۔ ساری دنیا کی اکثریت بھی اس میں تبدیلی نہیں کر سکتی۔ کیوں نہیں کر سکتی؟ اس لیے کہ یہ انسان کا بنایا ہوا نہیں ہے۔ کیا جواب ہے؟ ''میں کیسے کر سکتا ہوں۔ یہ تو میرا بنایا ہوا ہی نہیں ہے۔ یہ No Compromise ہے''۔ دوسری جگہ ہے: وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ (11:113)۔ وہاں نبی اکرم ﷺ سے بات ہو رہی تھی۔ حضور ﷺ سے ہی کہا گیا تھا۔ یہاں یہ پوری کی پوری جماعتِ مومنین جو امتِ مسلمہ ہے' جو مسلمان ہیں' ان سب سے کہا گیا ہے کہ یاد رکھو! ''ان کی طرف ذرا سا بھی نہ جھک جانا' ان کے ساتھ کوئی Compromise نہ کرنا۔ اگر یہ کیا' اگر تم ذرا سے جھکے تو جہنم میں چلے جاؤ گے' جس میں یہ سارے جائیں گے' یہ تباہی کی آگ کے شعلوں کی لپیٹ میں ہوں گے۔ اس تباہی سے بچانے والا صرف خدا کا قانون ہے۔ اس کے سوا تمہارا کوئی حامی و ناصر نہیں۔ اگر اس کا سررشتہ ہاتھ سے چھوٹ گیا تو پھر کہیں پناہ نہیں مل سکتی۔'' اس لیے کہ اصول میں ذرا سی تبدیلی کی اور پھر وہ ساری کی ساری تو کیا' اس نے تو اس سارے اصول کا ہی بیڑہ غرق کر دیا۔

دین میں Compromise (مفاہمت) شرک ہے

میں نے کہا ہے کہ آپ کے جو بچوں میں سے پانچویں' چھٹی جماعت کا بچہ حساب کا سوال نکال رہا ہوتا ہے اگر وہ کسی جگہ ضرب تقسیم کے کسی ایک ہندسے کے اندر تھوڑی سی غلطی کر دے یا Compromise (مفاہمت) کر جائے تو پھر دیکھیے کہ آخر تک سارا ہی سوال غلط ہو جاتا ہے۔ اس سوال میں یہ نہیں ہوتا کہ وہ جو ایک Digit (ہندسہ) غلط ہوا ہے اس کے اتنے نمبر کاٹ دیئے جائیں تو پھر سارے سوال پہ ہی لکیر لگ جاتی ہے۔ دین میں تو Compromise کی کوئی صورت نہیں ہوتی ہے۔ ہاں' ایک ریفرنس لے لیجیے یہ آپ کے کام آئے گا۔ پتہ نہیں ''تبویب القرآن''[1] کب آئے۔ اس میں آپ کو یہ سب کچھ ملے گا۔

فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ (68:8-9)۔ بڑی کوششیں کریں گے کہ تجھے اپنے مقام سے پھسلا دیں۔ یہاں لفظ مداھنت ہے۔ یہ لفظ خوب ہے۔ ''دوھنیت'' ''پھسلنا'' ہوتی ہے۔ ویسے تو یہ پھسلنا ہر جگہ خطرناک ہوتا ہے لیکن اگر اس قسم کا فرش ہو اور اس پہ کہیں تھوڑا سا تیل گر جائے یا ویسلین (Vaseline) گر جائے یا کیوں نہ ذرا سا دودھ ہی گر جائے تو وہ جو پھسلنے والی روغنیت کی چیز ہوتی ہے' وہ اگر اس پہ ہو اور پھر آپ پھسلیں تو جو حشر ہوتا ہے' وہ آپ خوب دیکھتے اور سمجھتے ہیں۔ کیا لفظ ہے

---

[1] اب یہ کتاب چھپ چکی ہے۔

Marfat.com

قرآن کا! کہا کہ یونہی چند قطرے تیل کے اس فرش پر گرائیں گے' اگر تم نے یہ تسلیم کرلیا کہ ہاں میں اسی پہ پاؤں رکھ کے چلوں گا تو پھر اس کے بعد جو پاؤں پھسلے گا' سوائے اس کے کہ جہنم میں جا کے تمہارا ٹھکانہ ہوگا' اس سے ورے بچ ہی نہیں سکو گے۔ یہ لوگ اس قسم کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ نہ سمجھ لینا کہ یہ ذرا سی پھسلن ہے۔ یہ تو ایک جگہ' ایک مقام' سے پھسلے تو پھسلنے کے بعد پھر پتہ نہیں کہ کہاں تک پھسلتے چلے جاؤ گے۔ قرآنِ کریم کہتا ہے کہ ان کی کوششیں یہ ہیں کہ یہ ایسا کچھ کریں۔ اس طرح کچھ تم اپنے مقام سے ہٹو' کچھ یہ نرم پڑیں اور اس طرح تم دونوں میں مفاہمت (Compromise) کی شکل پیدا ہو جائے۔ اس لیے ان کی بات بالکل نہ ماننا۔

قرآن کے اصول پر جم کر کھڑے ہونے کا نتیجہ ثبات ہے

یہ قرآنِ کریم ہے عزیزانِ من! اگلی آیت آئی: وَلَوْلَآ اَنْ ثَبَّتْنٰکَ لَقَدْ کِدْتَّ تَرْکَنُ اِلَیْھِمْ شَیْئًا قَلِیْلًا (17:74)۔ اگر خدا کی اس کتاب' قرآن' نے تمہیں اپنے مقام کے اوپر ثابت قدم نہ رکھا ہوتا' تو ہو سکتا تھا کہ تم ان کی باتوں میں آ کے کچھ تھوڑا سا Compromise (مفاہمت) کر لیتے۔ یہ قرآن ہے' جو تمہیں تھامے ہوئے ہے۔ قرآن کیسے تھام لیتا ہے؟ یہ ایمان ہے کہ اس قرآن کی ذرا سی بات کے خلاف بھی میں نے کوئی بات نہیں کرنی۔ اس ایمان کی وجہ سے قرآن تھام لیتا ہے۔ یہ ثبات اس کی وجہ سے حاصل ہوا ہے۔ یہاں نبی اکرمؐ سے یہ کہا گیا کہ اس کی وجہ سے ثبات حاصل ہوا ہے۔

قرآنی اصولوں کو بتدریج نازل کرنے میں حکمت

اس ثبات حاصل ہونے کے بھی دو چار ریفرنسز دیکھ لیجیے۔ ایک اور حوالہ ہے: وَقَالَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَیْہِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَۃً وَّاحِدَۃً (25:32)۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ قرآن بنا بنایا' لکھا لکھایا' ایک ہی دفعہ کیوں نہ دیدیا گیا۔ کہا: انہیں پتہ نہیں ہے۔ کَذٰلِکَ لِنُثَبِّتَ بِہٖ فُؤَادَکَ وَرَتَّلْنٰہُ تَرْتِیْلًا (25:32)۔ ایک ایک اصول' ایک ایک حکم' ہم نے تیئس سال کے عرصے میں آہستہ آہستہ' آہستہ آہستہ اتارا' تا کہ ایک اصول پر عمل کرنے سے تمہارے پاؤں جم جائیں تو پھر اگلا اصول دیا جائے۔ قدم بقدم 'بتدریج (Gradually) جیسے بچوں کو چلنا سکھایا جاتا ہے' پہلے ہی دن ان کو دوڑنا نہیں سکھا دیا جاتا۔ اپنے پاؤں پہ کھڑے ہونے کے لیے بڑی تدریج چاہتا ہے۔ یہ ہے عزیزانِ من! نبی اکرمؐ کے متعلق جو یہاں کہا گیا ہے اور اس کے معنی یہ ہیں کہ جب بھی غیر قانونی معاشرے سے قانونی معاشرے کی طرف چلیں گے' آپ کو بتدریج ہی چلنا ہوگا لیکن اس تدریج میں اصول یہ سامنے رہے کہ جس اصول پہ آپ نے عمل کرنا ہے' اس میں کسی کے ساتھ Compromise نہیں ہو سکتا۔ ٹھیک ہے بتدریج چلیے۔ یہاں ایک دوسرے مقام پہ نبی اکرمؐ سے کہا: قُلْ نَزَّلَہٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّکَ بِالْحَقِّ (16:102)۔ اللہ کی طرف سے حق کے ساتھ یہ روح القدس تیری طرف نازل کیا ہے۔ لِیُثَبِّتَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (16:102)۔ تا کہ یہ ان کے' جو اس کا یقین رکھنے والی قوم ہے' کے پاؤں میں لغزش نہ

Marfat.com

آنے دے' ان کو ثبات حاصل ہو تو قرآن ہی سے ثبات ہو سکتا ہے۔ یہ کیا بات ہے' جو اس سے ثبات ہو سکتا ہے! کہا: ثبات' یہی چیز ہے کہ یہ قانون ہمارا وضع کردہ نہیں ہے' یہ قانون ہم نے نہیں بنایا' پہلے ہی دن یہ فیصلے کر لو کہ یہ Constitution (آئین) ہمارا نہیں ہے۔ ہم اس میں کسی قسم کی تبدیلی کرنے کے مجاز نہیں ہیں۔ اب بھی جب یہ کہتے ہیں کہ وہ Constitution Central گورنمنٹ (مرکزی حکومت) کا ہے۔ اس میں پراونشل (صوبائی) گورنمنٹ کا گورنر دخل نہیں دے سکتا۔ یہ کیا ہوتا ہے؟ یہ ہوتا ہے کہ یہ کچھ Within my Power نہیں ہے۔ یہ ان کا ہے اور جب یہ پوری جماعتِ مومنین بمعہ رسول کے یہ کہے کہ یہ ہمارا نہیں ہے' یہ خدا کا ہے' تو وہ ان میں سے کوئی بھی اس میں تبدیلی نہیں کر سکتا۔ یہ ہے جسے ثبات کہتے ہیں۔

کلمۃ طیبۃ کا مفہوم

یہی ہے جسے قرآن نے کلمۃ طیبۃ کہا ہے۔ دوسری جگہ کہا: اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ (14:24)۔ قرآن کی مثال' ایک نظریہ حیات' کلمہ طیبہ' خوشگوار نظریہ حیات کی ہے' جس میں پھل لانے کی صلاحیت موجود ہے۔ اس درخت کی کیفیت یہ ہے کہ اس کی جڑیں پاتال [1] میں ہیں' اس کی شاخیں آسمان کو چھو رہی ہیں۔ تمہاری مادی دنیا کے اندر اس کی جڑیں ہیں لیکن اس کا اپنا سانس عرشِ الٰہی سے ملنے والا کلمہ طیبہ ہے۔ آگے اس کلمہ طیب کے متعلق کہتے ہوئے' قرآن میں آیا ہے کہ يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ (14:27)۔ یہ ہے وہ قولِ ثابت' وہ محکم نظریہ حیات' جس کی وجہ سے جماعتِ مومنین کو ثبات حاصل ہوگا' یہ ثبات و استحکام اس نظریہ کی وجہ سے ہوگا۔ ثبات کہاں حاصل ہوگا؟ کہا: قیامت میں جا کے نہیں بلکہ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (14:27)۔ یہیں ہوگا' اسی دنیا میں حاصل ہوگا۔ وَفِي الْاٰخِرَةِ (14:27)۔ اور وہاں آخرت میں بھی ہوگا۔ پہلے فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ہوگا' قرآن کے ساتھ انتساب [2] کا پہلا نتیجہ یہاں ثبات ہے: فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا اور ثبات تو بڑی چیز ہے' جس قوم کو ثبات حاصل ہو جائے' وہی قوم زندہ رہتی ہے۔ قرآن نے کہا ہے کہ کسی قوم کے ساتھ اپنے اصولوں میں Compromise (مفاہمت) کرنے کی صورت نہ کرو عزیزانِ من! کہا کہ اگر قرآن تمہیں بھی ثابت نہ رکھتا تو ہو سکتا تھا کہ یہ مملکت کے تقاضے' مفاد پرستیاں' مصلحت گیریاں' حکمتِ عملی تمہیں اس چیز پہ آمادہ کر دیتیں کہ کچھ تو تھوڑا سا Compromise (مفاہمت) کر لو: کچھ تم بڑھو' کچھ ہم جھکتے ہیں تو اس طرح معاملات دگرگوں ہو جاتے۔

---

[1] تحت الثریٰ' زمین کا سب سے نیچے کا برت۔
[2] لگاؤ' تعلق

Marfat.com

رسول کو عام لوگوں سے دگنی سزا!

سنیے عزیزانِ من! اس کی یہ ذمہ داریاں کہ جو قرآن کو ہاتھ میں لے کے اپنی امت یا اپنی قوم کے لیے رہبر بنتا ہے' کہا: اگر اے رسول! تم نے ایسا کر لیا ہوتا: اِذًا لَّاَذَقْنٰکَ ضِعْفَ الْحَیٰوۃِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ (17:75)۔ تو یاد رکھو اس زندگی میں بھی تجھے عام لوگوں سے دگنی سزا تجھے ملتی' آخرت میں بھی تجھے دگنی سزا ملتی۔ عام افراد کی جو لغزش ہوتی ہے' جو جرم ہوتا ہے' اس کے اثرات اس کی ذات تک رہتے ہیں۔ یہ جو سربراہ یا لیڈر یا راہنما یا قائد ہوتا ہے' عزیزانِ من! اس کی جو ذرا سی لغزش ہے' وہ بڑی متعدی ہوتی ہے' قوموں کی قوموں کو تباہ کر دیتی ہے۔ اسی لیے یہ کہا کہ اے رسول! اگر تو بفرضِ محال اس اصول کے اندر ایسا Compromise کر لیتا 'لچک پیدا کر دیتا تو یاد رکھو! اس زندگی میں بھی تمہیں دگنی سزا ملتی' قیامت میں بھی دگنی سزا ملتی' اور یہ وہ سزا تھی کہ ثُمَّ لَاتَجِدُ لَکَ عَلَیْنَا نَصِیْرًا (17:75) ۔ ہمارے خلاف کوئی تیری مدد نہ کر سکتا۔ یہ کچھ رسول اللہؐ سے کہا جا رہا ہے' عزیزانِ من! یہ ہے دین' یہ مذاق نہیں ہے۔ عزیزانِ من! ہم سورۃ بنی اسرائیل کی آیت 75 تک آ گئے' 76 ویں آیت سے آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ.

Marfat.com

چودھواں باب: سورۃ بنی اسرائیل (آیات 76 تا 81)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَاِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ مِنَ الْاَرْضِ لِيُخْرِجُوْكَ مِنْهَا وَاِذًا لَّا يَلْبَثُوْنَ خِلٰفَكَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۷۶﴾ سُنَّةَ مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُّسُلِنَا وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيْلًا ﴿۷۷﴾ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ ؕ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا ﴿۷۸﴾ وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ۖ عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ﴿۷۹﴾ وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِيْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِيْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّيْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا ﴿۸۰﴾ وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ؕ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ﴿۸۱﴾

عزیزانِ من! آج ستمبر 1975 کی 7 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ بنی اسرائیل کی آیت 76 سے ہو رہا ہے۔ 17:76۔ سابقہ آیات میں یہ حقیقت ہمارے سامنے آئی تھی کہ اس نئے نظام کی مخالفت کرنے والوں کا پہلا حربہ یہ تھا کہ چونکہ یہ جماعت بڑی کمزور سی تھی' اس لیے ان پر بڑے مظالم ڈھائے گئے تاکہ یہ لوگ اس کا ساتھ چھوڑ دیں۔ وہاں بھی انکو سخت ناکامی ہوئی۔ اس کے بعد اس جماعت کو تقویت حاصل ہوتی گئی' یہ مؤثر ہوتی چلی گئی تو پھر انہوں نے دوسرا یہ حربہ اختیار کیا کہ ان سے کچھ مفاہمت کر لی جائے' کچھ Compromise کر لیا جائے۔ سابقہ آیات میں یہی کہا گیا تھا اور حضور ﷺ سے تاکید کی گئی کہ ان سے Compromise (مفاہمت) کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ دونوں نظام' ایک وہ کہ جس کی تم دعوت کو لے کر اٹھے ہو اور دوسرا وہ کہ جس پر یہ کاربند ہیں' باہم دگر متضاد ہیں' متخالف ہیں' ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ایک حق ہے' دوسرا باطل ہے۔ ایک صحیح ہے' دوسرا غلط ہے تو ان دونوں میں Compromise (مفاہمت) کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ Compromise (مفاہمت) وہاں ہوتا ہے' جہاں ایک شخص خود اپنے مصالح' اپنے مفادات' اپنی Configuration کی بناء پر ایک بات کہے' دوسرا اپنی خواہش اور اپنے مصالح کی بات کہے تو یہ ہو سکتا ہے کہ آپس میں Compromise (مفاہمت) کرنے کے لیے کچھ وہ چھوڑ دے' کچھ یہ آگے بڑھے۔ دوکاندار کسی پانچ روپے کی چیز کی قیمت دس روپے بتائے گا اور یہ اسے چار روپے دے گا تو پھر ٹھیک ہے' باہم مصالحت ہو جائے گی۔ وہ نیچے اترے گا' یہ آگے بڑھے اور اگر کہیں کسی میں' آپ اسے اصول سمجھ لیجیے' Policy سمجھ لیجیے' کی بنیاد پر قیمت مقرر ہوتی ہے تو پھر اس میں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ گاہک کی طرف سے' دوکان کی طرف سے' کوئی نیچے اتر جائے کیونکہ یہاں معاملہ قیمت کا نہیں' اصول کا ہے' حق کا ہے۔

Marfat.com

حق کی تعریف

حق تو اپنے مقام پہ اتنا اٹل ہوتا ہے کہ وہ حق ہوتا ہی اس وقت ہے' جب اپنے مقام پہ قائم رہتا ہے۔ جب وہ اپنے مقام کو چھوڑ دیتا ہے تو اسے حق کہا ہی نہیں جاتا' یہ بس یہی اک صورت ہے۔ جب یہ اپنے مقام کو چھوڑ دیتا ہے' یہ اسی وقت باطل ہو جاتا ہے۔ جیسے جو سوال غلط ہوتا ہے تو وہ ہمہ وقت' ہمہ جہت' ہمہ نسبت' غلط ہوتا ہے' ایسا کبھی بھی نہیں ہوتا کہ اس میں نسبت 9:10 ہو تو صحیح ہو لیکن 1:10 ہو تو غلط ہو۔ یا وہ غلط ہے یا وہ صحیح ہے' بس یہی ایک صورت ہے۔ تو حق تو مصالحت اور مفاہمت جانتا ہی نہیں ہے۔ اس لیے یہ لوگ یہاں بھی ناکام رہے۔

اس کے بعد اگلا طریقہ پھر یہ ہوا کہ یہ دھاندلی پہ اتر آئے کہ اگر یہ نہیں ہوتا تو انہیں یہاں اتنا تنگ کیا جائے کہ اس تصادم اور ٹکراؤ سے یہ اس ملک کو چھوڑ کر کہیں چلے جائیں اور اس کے بعد ان کی جتنی بھی کوششیں تھیں' وہ یہ تھیں کہ Compromise (مفاہمت) ہی ہو جائے۔ کہا گیا کہ آپ انہیں دیکھ لیجیے۔ یہ کوئی مذہب کا' پوجا پاٹ کا' رسومات کا' معاملہ نہیں تھا۔ اس میں کسی سے کوئی شکایت نہیں تھی' یہ جسے مذہبی آزادی دینا کہتے ہیں' یہ ساری مملکتیں اپنے اپنے مفاد' اپنے اپنے مصالح' کو محفوظ کر لیتی ہیں پھر اس کے بعد مذہبی آزادی Declare کر دیتی ہیں:

بجتا ہے فقط چرچ میں اتوار کو گھنٹہ
سنکھ ہائے صدا گونجتی ہے ہر روز برادر

یہ ٹھیک ہے: تم سنکھ [1] بجاتے رہو' یہ اذانیں دیتے رہیں۔ تم گھنٹے بجاتے رہو' تم بتوں کے سامنے جا کے پوجا کر لو۔ یہ گرجے میں چلے جائیں۔ تم مسجد میں چلے جاؤ۔ اس سے کسی کا کچھ بگڑتا ہی نہیں ہے۔ بگڑتا تو وہاں ہے جہاں کوئی کسی دوسرے کے معبود کو' کسی دوسرے کے مقدس بزرگوں کو' گالیاں دے' ان کی توہین کرے۔ بگاڑ کی یہ چیز وہیں جا کے ہوتی ہے اور قرآن نے تو ان سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ یہ چیز کفر کی ہے۔ اس لیے کہ ان کے بتوں کو کہیں گالی تک نہ دینا۔ یاد رکھیے! یہ مقابل میں آ کے اسی طیش میں خدا کو گالیاں دینے لگ جائیں گے تو جھگڑا پیدا ہو جائے گا۔ دین پیچھے رہ جائے گا اور تم اسی میں الجھ کے رہ جاؤ گے تو انہیں یہ تاکید کی گئی کہ ان کے معبودوں کو گالی تک نہ دو۔ باقی رہے ان کے بزرگ جنہیں وہ اپنے انبیاء کرام مانا کرتے تھے' خواہ وہ یہودیوں کے تھے یا عیسائیوں کے' حتیٰ کہ عرب کے بھی جو مورثِ اعلیٰ تھے' حضرتِ ابراہیمؑ یا حضرت اسماعیلؑ جن کی وہ اولاد تھے' یہ مسلمان تو ان سب کو خدا کے رسول مانتے تھے اور رسولوں کی صورت یہ تھی کہ پہلے ان پہ ایمان لاؤ اور پھر محمد رسول اللہؐ پہ ایمان لاؤ۔ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ (2:136)۔ رسول ہونے کی جہت سے ان سے کسی میں' کوئی تفریق نہ کرو۔

---

[1] ناقوس' کوڑی' حرمہرہ۔

Marfat.com

ان کا جزوِ ایمان یہ تھا کہ باطل کے معبودوں کو اور ان کے بتوں کو کسی طرح سے بھی خراب نہ کرو' ان کی شان میں گستاخی نہ کرو' ان کے بزرگوں میں سے ہر ایک کو رسول سمجھو۔ تو سوال یہ تھا ہی نہیں کہ وہ اس بات پہ ان کے مخالف ہوں کہ صاحب! تم ہمارے معبودوں کو گالیاں دیتے ہو' ہمارے بزرگوں کی شان میں گستاخیاں کرتے ہو۔ یہ بات تھی نہیں۔ اب بھی غیر مسلم اپنے ہاں' جس طرح جی چاہے' اپنی اپنی پرستش کریں' عبادت کریں' پوجا پاٹ کریں' ان سے کوئی مزاحم نہیں ہوتا۔ یہ مزاحم اس وقت ہوتے ہیں جب وہ بزرگوں کی شان میں' نبی اکرمؐ کی شان میں' گستاخی کریں۔ تو وہاں مسلمانوں کے ہاں اس طرح کی کوئی بات تھی ہی نہیں تو پھر یہ لوگ کیوں اس قدر تصادم پہ اتر آتے تھے؟ کس بات پہ یہ ٹکراؤ اتنا زیادہ تھا؟ کیا یہ معاملہ مذہب کا تھا؟ اس تصادم کی اصل وجہ کیا تھی؟

اس تمام تر مزاحم کی وجہ مذہب نہیں' دین تھا

عزیزانِ من! یہ مذہب کا معاملہ تھا ہی نہیں۔ یہ دین کا معاملہ تھا۔ یہ زندگی کے نظام کا معاملہ تھا۔ ایک نظام ان کا تھا جس میں انہیں سارے مفادات حاصل تھے اور وہ مظلوم' کمزور' ضعیفوں کی آبادیوں کا استحصال کرتے تھے' Exploit کرتے تھے۔ ایک یہ ان کا نظام تھا' جو ان کے ہاتھوں سے اقتدار اور Sovereignty چھینتا تھا اور ان کمزوروں اور مظلوموں کو ان سلب و نہب کرنے والوں کی سطح پہ لا رہا تھا۔ یہ دو نظاموں میں ٹکراؤ تھا اور یہ وہ چیز ہے' جسے وہ دیکھ ہی نہیں سکتے تھے۔ پہلی بات تو یہ کہ غالب نظام والے' جن کا نظام متمکن ہوتا ہے' یہ برداشت ہی نہیں کر سکتے کہ کہیں کوئی ایسا نظام مسلط ہو جائے' جو ان کے اس نظام کی شکست کا باعث بن جائے۔ یہ آپس میں ٹکراؤ کی بات تھی۔ اس میں یہ کہا گیا کہ کسی قسم کی کوئی مفاہمت نہیں ہو سکتی تو دوسرا حربہ یہ تھا کہ انہیں یہاں اتنا تنگ کرو کہ یہ ملک چھوڑ کے چلے جائیں۔ یہ قرآن کے الفاظ میں یوں ہے کہ وَاِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ مِنَ الْاَرْضِ لِيُخْرِجُوْكَ (17:76)۔ اب پھر کوشش یہ ہوگی کہ تمہیں اتنا تنگ کیا جائے کہ تم ملک چھوڑ کے بھاگ جاؤ۔ جو شخصیت ایسا انتظام کر رہی ہو' جو کسی اصلاح (Reformation) کے لیے اٹھی ہو' اس کے پروگرام کی آخری کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ اس سرزمین کو چھوڑ کے دوسری جگہ چلی جائے۔ اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اب جو لوگ اس نظام کے حامل ہیں' وہ اس درجہ پہ پہنچ چکے ہیں کہ اب یہاں ان کی بقاء اور زندگی کی کوئی صورت باقی نہیں رہی اور وہ انہیں اسی طرح چھوڑ جاتا ہے جیسے ایک ڈاکٹر اس وقت مریض کی چارپائی سے اٹھ جاتا ہے' جب وہ اس کے علاج کی طرف سے بالکل مایوس ہو جائے۔ یعنی کسی مریض کی صحت یابی کی' جب آس ٹوٹ جائے' تو معالج اٹھ جاتا ہے۔

ہجرت کا مفہوم

بالکل اسی طرح کسی قوم کی اصلاح کے سلسلہ میں جب ان کی بقاء اور زندگی کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی' وہ نبی اس مقام کو چھوڑ کر کسی دوسرے مقام پہ چلا جاتا ہے' جس کی فضا اسی پروگرام کے لیے سازگار ہوتی ہے۔ کسی نبی کا یہ عمل ہجرت کہلاتا ہے۔ یہ اس پروگرام

میں بڑا اہم مرحلہ ہوتا ہے۔ یہ فرار نہیں ہے' یہ Escape نہیں ہے' بھاگ جانا نہیں ہے' میدان چھوڑ جانا نہیں ہے بلکہ یہ اعلان کر کے اٹھ جانا ہے کہ اب تمہارے بچنے کی کوئی صورت باقی نہیں رہی اور تم ہلاک ہوا چاہتے ہو' میں تمہارے ساتھ ہلاک نہیں ہونا چاہتا' اب تم بچ نہیں سکتے اور یہ لو میں اب گیا۔ یہ کہا کہ وَاِذًا لَّا یَلْبَثُوْنَ خِلٰفَکَ اِلَّا قَلِیْلًا (17:76) ۔ اگر اس نے ایسی صورت پیدا کر دی تو پھر تمہارے چلے جانے کے بعد یہ بھی جیتے نہیں رہیں گے' تمہارے یہاں ہونے سے تو پھر بھی یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ ممکن ہے' ان میں اصلاح ہو' یہ بدل جائیں' اس مریض کی بالیں ❶ سے تمہارے اٹھ کے چلے جانے کے معنی یہ ہونگے کہ اب انہیں کوئی نہیں بچا سکتا۔ کیسا انداز ہے کہ بزعمِ خویش تو یہ سمجھیں گے کہ ہم نے میدان مار لیا' وہ بھاگا۔ انہیں یہ پتہ نہیں ہے کہ یہ بھاگنا نہیں ہے۔ یہ تمہاری تباہی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر اپنے لیے نئے مقام پہ چلے جانا ہے۔ تم اب نہیں بچ سکو گے تو قرآن نے کہا ہے کہ اے رسول! یہ بات صرف تمہارے ہی ساتھ نہیں ہو رہی' یہ تو سُنَّةَ مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا قَبْلَکَ مِنْ رُّسُلِنَا وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِیْلًا (17:77) ۔ ہر رسول کے ساتھ یہی معاملہ ہوتا رہا۔ ان Stages سے ہر ایک کو گذرنا پڑا تھا۔ ہمارے قوانین اور دستور اٹل ہوتے ہیں تُو ان میں کبھی تبدیلی نہیں پائے گا۔

ذاتی مفاد پرستی کے بالمقابل نوعِ انسانی کی منفعت کا نظام

دو نظاموں کے درمیان یہ ایسی کشمکش ہے' جو شروع سے چلی آ رہی ہے۔ ایک طرف انسان کا ذاتی مفاد پرستیوں کا نظام ہوتا ہے' اس کے مقابلے میں مَا یَنْفَعُ النَّاسَ (13:17) کا نظام ہے جو نوعِ انسانی کی منفعت چاہتا ہے۔ پہلے دن سے آخر تک انبیاء کرامؑ اور ان کی تعلیم کا یہی سلسلہ رہا ہے۔ انبیاء کرام محض پرستش سکھانے کے لیے' پوجا پاٹ کے طریقے بتانے کے لیے' نہیں آیا کرتے تھے۔ ایک نظام کو الٹ کے اس کی جگہ خداوندی نظام قائم کرنے کے لیے آیا کرتے تھے۔ تو اس لیے ہر رسول کی مخالفت ہوتی تھی اور قرآن کہتا ہے کہ ان Stages سے ہر ایک کو گذرنا ہوتا تھا۔ آخر میں یہ سٹیج آ جاتی تھی جب وہ اس مقام سے' اس بستی سے مایوس ہو کر' کسی ایسی دوسری جگہ چلے جاتے تھے جہاں وہ مطمئن ہوتے تھے۔ کہا: یہ تو طریق شروع سے چلا آ رہا ہے۔ مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا قَبْلَکَ (17:77) ۔ یہ جتنے رسول بھی تم سے پہلے آئے' انہیں لوگوں نے اسی طرح تنگ کیا۔ وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِیْلًا (17:77) ۔ ہمارا دستور اٹل رہا۔ لوگوں کی بھی یہی روش رہی اور ہماری بھی یہی روش رہی۔ اس کے بعد جب بھی یہ دیکھا گیا کہ اب ان کی اصلاح کی کوئی صورت باقی نہیں رہی ہے تو رسول اپنی اس جماعت کو لے کے وہاں سے نکل آیا ہے۔ اس کے بعد وہ قوم تباہ ہو گئی ہے۔ کسی معاشرے کے اندر' اصلاح کرنے والے پُرخلوص افراد کا' اس مایوسی کی حالت پہ پہنچ جانا کہ اب تو ان کے بچنے کی کوئی شکل نہیں ہے' اس قوم کے لیے ایک بڑا جانگداز مرحلہ ہوتا ہے۔ اس کے بعد ان کے بچنے کی کوئی صورت نہیں رہتی۔ ان حق بات کہنے والوں کو کبھی اس مقام تک نہیں پہنچا دینا

---

❶ سرہانہ۔ سودا کی جو بالیں پہ ہوا شور قیامت خدامِ ادب بولے: ابھی آنکھ لگی ہے

Marfat.com

چاہیے کہ وہ ان کیطرف سے مایوس ہوکر اٹھ کے چلے جائیں۔ پھر وہ قوم باقی نہیں رہتی۔

رسول آنے بند ہو گئے' یہ ٹھیک ہے لیکن سنۃ اللہ تو اسی طرح سے جاری وساری ہے۔ رسول کا دیا ہوا پیغام تو قیامت تک کے لیے محفوظ ہے۔ اگر کسی جگہ بھی اس پیغام کو پہنچایا جائے گا تو اس کے مقابل میں ردِعمل یہی ہوگا کہ ان کا گلا گھونٹ دیا جائے' ان کے پیچھے ڈگڈگی لگادی جائے' کوئی ان کی آواز نہ سننے پائے حتّٰی کہ انہیں اتنا مجبور کر دیا جائے کہ اگر یہ ملک نہیں چھوڑتے تو آواز دینا بند کر دیں۔ تو یاد رکھیے! یہ اُن کی شکست نہیں' یہ شکست اِن کی ہے جو ان کا گلا گھونٹنے کی یہ آواز دیتے تھے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کی ہلاکت کے دن قریب آ چکے ہیں کہا کہ: وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيلًا (17:77)۔ ہمارا یہی طریق چلا آ رہا ہے۔ ہمارے قوانین اور دستور اٹل ہوتے ہیں اور تم خدا کے قانون میں کبھی تبدیلی نہیں پاؤ گے۔ جو کچھ تمہارے ساتھ ہو رہا ہے' یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ اب ایک طرف تو یہ کہا کہ ان کے ساتھ Compromise کی شکل بھی ختم ہو گئی۔

کفار کی آئے دن مدینے پہ یورش کی وجہ

یہ بھی ہے کہ اگر یہ بات مکہ میں ہوئی تھی تو حضور ﷺ ہجرت کر کے مدینے میں آ گئے تھے۔ مدینے میں آنے کے بعد بھی ان مکہ والوں کی' ان قریش کی' اور خود مدینے کے ان یہودیوں کی' جو یہاں کے رہنے والے تھے اور اس کے علاوہ ان منافقین کی' یہ بھرپور کوشش تھی کہ آپ کو یہاں مدینے میں بھی ایسی شکست دی جائے کہ یہ اس سرزمین کو بھی چھوڑ کے چلے جائیں۔ یہ مکہ والے جو ہر تیسرے دن یورش کر کے آ جاتے تھے' مدینے پہ چڑھائیاں کرتے تھے' کاہے کے لیے کرتے تھے؟ اب تو وہاں انہیں' ان کی پرستش کو' ان کی بت پرستی کو' روکنے والا کوئی باقی نہیں رہا تھا۔ یہ کیوں چڑھائیاں کر کے یہاں مدینے میں آتے تھے؟ اس زمانے کا تین سو میل کا سفر کوئی چھوٹی بات نہیں تھی۔ وہ یہاں روز چڑھائیاں کرنے کے واسطے آتے تھے کہ یہاں کہیں ان کا یہ نظام متمکن نہ ہو جائے۔ اگر یہ ایک جگہ متمکن ہو گیا تو پھر یہ ساری دنیا میں پھیل جائے گا۔ اس بات کا انہیں خوب اندازا تھا۔

پروگرام کی تکمیل کے لیے اور زیادہ سرگرمِ عمل ہونے کی تاکید

تو یہ کہا کہ کوئی بات نہیں۔ اگر مدینے میں آنے کے بعد بھی وہی صورت ہو تو بھی حضور ﷺ سے یہ کہا کہ Compromise (مفاہمت) کی بات نہیں ہے۔ ان سے کبھی Compromise (مفاہمت) نہیں کرنا لیکن اب تصادم بڑی سختی اختیار کر جائے گا۔ اس کے لیے اب دوسری طرف سے آپ کو یہ تاکید کی گئی کہ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا (17:78)۔ اب تم کیا کرو؟ یہ تو تمہاری مخالفت میں اور زیادہ کوششیں کریں گے' فوجیں اکٹھی کریں گے' اپنے ہاں اسلحہ اکٹھا کریں گے' کاوشیں کریں گے۔ تم کیا کرو؟ تم اس پروگرام کو مستحکم کرنے کے لیے پہلے سے زیادہ سرگرمِ

عمل ہو جاؤ۔ اس کا لفظی ترجمہ تو عام یہ کیا جاتا ہے کہ ''تم دلوک الشمس سے غسق الیل تک صلوٰۃ کو قائم کرو اور صبح کے وقت قرآن کا مطالعہ بڑا مشہود ہوتا ہے۔'' یعنی اتنا عظیم پروگرام' اتنی بڑی مخاصمت' تصادم' ٹکراؤ اور اس کے بعد یہی کہ زیادہ نمازیں پڑھا کرو۔ یہ تو وہی ہے جو ہم کرتے ہیں' تو پھر بھی تباہیاں آتی ہیں۔ اس پر تو وہ دو تین چار قسم کی اور نمازیں ہیں جن کو پڑھا دیا جاتا ہے کہ اب یہ کچھ اور نمازیں پڑھا کرو' کوٹھے پہ کھڑے ہو کے اذانیں دیا کرو۔ یہی کچھ ہو جاتا ہے۔ تو آپ سمجھتے ہیں کہ خدا نے پروگرام دینا تھا' انہیں یہ کرنے دو' تم کچھ اور زیادہ نمازیں پڑھا کرو۔

عزیزان من! میں نماز کی تنقیص نہیں کر رہا' اس کی اہمیت کم نہیں کر رہا۔ بتا یہ رہا ہوں کہ یہ صلوٰۃ ہے۔ میں ابھی اس کے معانی بتاتا ہوں۔ آپ کو معلوم ہے' میں نے بتایا ہوا ہے کہ قرآنِ کریم کی رو سے صلوٰۃ دین کا پورا نظام ہے' جسے متمکن کیا جاتا ہے۔ اس کے لیے یہ بڑی جامع اصطلاح ہے اور اسی نظام کے لیے' یہ جو آپ کے ہاں اجتماعات ہوتے ہیں' جنہیں آپ وقتی نماز کہتے ہیں' یہ اس پروگرام کے اندر اجتماعات (Gathering Meetings) ہیں۔ ہر نظام کے لیے' ہر پروگرام کے لیے' آپ کو اکٹھا بیٹھ کے سوچنا پڑتا ہے۔ قرآن نے جہاں کہا ہے: اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (42:38)۔ وہاں صلوٰۃ کا ذکر ہے۔ تو صلوٰۃ کا قیام کرو اور معاملات کو باہمی مشورے سے طے کیا کرو۔ تو وہ صلوٰۃ تو کوئی ایسی چیز ہے کہ جس میں باہمی مشاورت سے کچھ معاملے طے کرنے پڑتے ہیں' جبکہ نماز کے وقت میں تو آپس میں بولنا ہی نہیں۔ یہ تو اس نظام کی بات ہے۔ پھر سن لیجیے کہ اس نظام کے اجتماعات کی بڑی ضرورت ہوتی ہے۔ اکٹھے بیٹھ کے' مشورہ کر کے' کچھ کرنا ہوتا ہے۔ یہ جو اس صلوٰۃ میں' جسے اب وقتی نماز کہتے ہیں' یہ وہ اجتماعات ہیں' جو اس نظام کے متعلق سوچ بچار کرنے کے لیے' باہمی مشاورت کے لیے' اکٹھا ہوا جاتا ہے۔ تو جہاں یہ قیامِ صلوٰۃ کی چیز آئے گی' اس کے معنی یہ ہونگے کہ اس نظام کو قائم کرنے میں پہلے سے زیادہ سرگرمِ عمل ہو جاؤ۔ یہ کہا کہ اگر پہلے کچھ تھوڑا سا وقت دیتے تھے یا کچھ وقت بچا لیتے تھے' تو اب وقت آ گیا ہے کہ تمہیں اس نظام کے لیے جو کوشش کرنی ہے۔ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ (17:78)۔ اس کے لیے تمہیں اب سورج نکلنے سے لے کر سورج غروب ہونے تک پورے کا پورا دن' سارا دن' سارا وقت' اس میں لگانا پڑے گا۔

قرآن پر غور و فکر کے لیے صبح اٹھنے کی تاکید کی ہے

اب رہی سورج کے نکلنے سے پہلے کی بات' اس کے لیے قرآن کریم نے کہا: وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا (17:78)۔ قرآن میں اور مقامات پہ بھی یہ بات آئی ہے۔ میں ابھی عرض کرونگا۔ قرآن بہت صبح اٹھنے کے لیے کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اٹھنا ہی بہت صبح چاہیے۔ یہ کہا کہ جب دن چڑھ جائے' دن نکل آئے تو اس کے بعد تو تمہارا عملی پروگرام شروع ہو جائے گا' سارا دن تگ و تاز میں لگے رہو گے۔ اس پروگرام کے شروع کرنے سے پہلے تو یقیناً بیٹھ کے سوچنا ہوگا کہ آج کیا کیا جائے' ہمیں کیا ہدایت ملتی ہے۔ کہا کہ اس سے پہلے جو فجر کا وقت ہوتا ہے' وہ سکوت کا وقت ہوتا ہے' سکون کا وقت ہوتا ہے۔ اس میں اٹھ کے سب سے

پہلے تو یہ دیکھو کہ قرآن تمہیں اس کے لیے کون سی ہدایت دیتا ہے' آج کیا پروگرام کرنا ہے۔ ہر نظام میں آپ دیکھیں گے کہ دن بھر میں جو کچھ کرنا ہوتا ہے' اس کے لیے پہلے صبح صبح اس پروگرام پر بیٹھ کے آپ غور و فکر کرتے ہیں کہ ''ہاں بھئی! آج کیا کرنا ہے' آج یہاں راج مزدور لگانے ہیں۔'' ان کے لیے' ان کے کام کرنے کے لیے تو آپ پہلے بیٹھ کے سوچتے ہیں کہ ''ہاں بھئی! آج کیا کیا کام کرنا ہے؟'' ہر کارخانے میں یہ ہوتا ہے' ہر نظام میں یہ ہوتا ہے کہ کام شروع کرنے سے پہلے یہ چیز Discuss کی جاتی ہے' غور و فکر کیا جاتا ہے کہ آج کیا کرنا ہے۔ یہ تھی وہ آج کیا کرنے والی بات جس کے لیے کہا کہ قبلِ شمس سے تم نے وہ شروع کر دینا ہے' اس پروگرام پر عملاً یہ کچھ کرنا ہے اور اس سے پیشتر اس کے متعلق سوچنا ہے کہ آج کرنا کیا ہے۔ یہ ہے قران الفجر۔ تو کہا کہ اس وقت بالکل سکوت و سکون ہوگا کہ ابھی زیادہ شور شرابا نہیں ہوگا' اس شور و غوغا قسم کی سرگرمیاں شروع نہیں ہوئی ہونگی' وہ سکون کا وقت ہوگا۔ اس وقت جو قرآن پہ غور و خوض کرو گے' قرآن نے اسے مشہود کہا ہے صاحب! تو اس کے جو بھی چھپے ہوئے حقائق ہیں' جو بھی مضمر حقائق ہیں' اس وقت سکون کے ساتھ ان پہ غور کرو گے تو وہ بالکل مشہود شکل میں تمہارے سامنے آ جائیں گے۔ یہ بات ٹھیک ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ غور و فکر کے لیے جو علی الصبح کا وقت ہوتا ہے' جب ابھی لوگ بھی جاگے ہوئے نہیں ہوتے' معاشرے میں بھی ابھی اس قسم کی تگ و دو شروع نہیں ہوئی ہوتی' وہ بڑا عجیب وقت ہوتا ہے۔ اس وقت کسی چیز پر بڑے سکوت اور کامل ارتکاز Concentration سے غور و فکر ہوتی ہے۔ کہتا ہے کہ اس وقت کا قرآن تو یوں سمجھو جیسے ایک محسوس شکل میں نکھر کے سامنے آ جاتا ہے۔

استغفار کا قرآنی مفہوم

قرآنِ کریم میں اور مقامات پہ مومنین کے پروگرام کے متعلق یہ خصوصیات بتائی ہیں: اَلصّٰبِرِیْنَ وَالصّٰدِقِیْنَ وَالْقٰنِتِیْنَ وَالْمُنْفِقِیْنَ (3:16)۔ ان کی یہ خصوصیات ہیں: ثابت قدم رہنے والے' نہایت صداقت پہ جم کر کھڑے ہو جانے والے' خدا کے قوانین کے مطابق اپنی توانائیاں صرف کرنے والے' اس کے لیے جو کچھ دینا پڑے اس کے لیے اپنے تجوری کھلی رکھنے والے اور وَالْمُسْتَغْفِرِیْنَ بِالْاَسْحَارِ (3:16)۔ اب ہمارے ہاں تو اس کے یہ ترجمے ہوتے ہیں کہ ''وہ صبح کے وقت استغفار کرنے والے ہیں یعنی وہ استغفار کی تسبیح کرتے ہیں۔ صبح تہجد کے بعد اٹھ کے نماز پڑھتے ہیں اور اس کے بعد استغفر اللہ ربی من کل ذنب و اتوب الیہ ہوتی ہے۔'' اب ہمارے ہاں تو استغفار کی یہی تسبیح رہ گئی ہے۔

استغفار کے معنی ہوتے ہیں: ''حفاظت چاہنا''۔ سحر کے معنی ہوتا ہے: ''کسی پروگرام کے شروع کرنے کا وقت''۔ پروگرام کو شروع کرنے سے پہلے یہ سوچتے ہیں کہ اس راستے میں جو خطرات آتے ہیں' ان سے حفاظت کی کیا تدابیر کی جائیں۔ وہ پہلے سوچ لیتے ہیں۔ یہ نہیں ہوتا کہ سوتے سوتے اٹھے اور یا علی مدد کہا: ''تے ٹوٹ پئے'' جناب![1] اور جب مشکلات سامنے آئیں تو پھر آنکھیں بند

[1] تو پھر پل پڑے' دفعتاً حملہ آور ہوئے یا کام میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔

Marfat.com

کر کے لیٹ گئے۔ کہا: چادر دے دیجیے۔ یہ ان کے ٹوٹ پڑنے کی بات غلط ہے۔ قرآن تو کہتا ہے کہ وہ پروگرام شروع کرنے سے پیشتر ہی حفاظت کے سامان کے متعلق سوچ لیتے ہیں کہ کس کس قسم کے خطرات و مشکلات کا امکان ہے اور اس کے لیے کیا کرنا چاہیے۔ یہ پوچھیے ان نبرد آزماؤں سے' جنہوں نے اس کے بعد جنگ کرنا ہوتی ہے کہ وہ اس میدان میں جانے سے پیشتر اپنے ہاں کیا کیا سوچتے ہیں اور اس میں سب سے بڑی سوچ یہ ہوتی ہے کہ دشمن سے بچنے کی کیا کیا تدابیر اختیار کی جائیں۔ پہلی سوچ یہ ہوتی ہے۔ وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ (3:16)۔ یہ ہے وہ جو یہاں قران الفجر ہے۔ اب اس کے بعد آیا ہے۔ بِالْاَسْحَارِ (3:16)۔ یہ وہ چیز ہے جو پروگرام شروع کرنے سے پہلے سوچ لیا جائے کہ خطرات و مشکلات کے کیا کیا امکانات ہیں اور خاص طور پر یہ کہ ان خطرات سے بچنے کے لیے کیا کرنا چاہیے۔

زندگی کے ہر شعبہ میں قرآن سے راہنمائی لینا ہوگی

عزیزان من! بات ہی یہ ہے کہ قرآن سے ساری راہنمائی لینی ہے۔ کوئی معاملہ سامنے آئے' اس کتاب کو کھول کے دیکھ لیجیے کہ یہ کیا کہتا ہے۔ اس کا دعوٰی یہ ہے کہ میرے بندوں سے کہدو کہ یہ بھی جب مجھے پکاریں گے' میں اس کا جواب دونگا۔ یہ جواب دیتا ہے کہ جو مشکل سامنے آ گئی ہے' اس کے لیے کیا کرنا چاہیے۔ اس کے لیے وہ یہ کہتا ہے کہ اپنے پروگرام سے پہلے تم صبح ہی یہ چیز کر لو۔ نبی اکرمؐ کے متعلق جو کہا ہے: اِنَّ لَکَ فِی النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيْلًا (73:7)۔ اب یہاں آپ کے ہاں' سبح کے معنی تسبیح کر دیا گیا اور کہا کہ تیرے لیے پورے دن میں سَبْحًا طَوِيْلًا آ گئی۔ لمبی لمبی تسبیحیاں آ گئیں۔ تو بات کہاں سے کہاں چلی گئی۔ جب کہ کہا یہ تھا کہ دن میں تجھے مخالفتوں کے ہجومِ پُر بلا کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ اس سلسلہ میں تیرے سامنے اتنے کام ہوتے ہیں کہ تجھے سارا سارا دن سرگرداں رہنا پڑتا ہے۔ لہٰذا جن امور کے لیے قدرے سکون و ثبات کی ضرورت' ان کے لیے وقت ہی نہیں مل سکتا۔

تسبیح کا مروجہ تصور اسلام میں ہے ہی نہیں

سبح یا تسبیح کے معنی ہوتا ہے: ''کسی کام کی تکمیل کے لیے' کسی مقصد کے حاصل کرنے کے لیے' انسان کا اس قدر سرگرمِ عمل رہنا' سرگرداں پھرنا کہ وہ ہر وقت اس کے لیے اپنی پوری توانائیاں صرف کرتا رہے''۔ اہلِ عرب گھوڑے کے اس عمل کو بھی سبح یا تسبیح کہتے ہیں: ''جب وہ تیرنے والوں کی طرح اپنی دونوں ٹانگیں اٹھا کے بھاگتا ہے' نیز تیراک جو تیراکی کے وقت اپنے پورے ہاتھ پھیلا دیتا ہے'' اور اس طرح تیرنے والے کو السَّبَّاح کہتے ہیں۔ التسبیح ''خدا کی اطاعت میں تیزی کرنے کو کہتے ہیں۔'' تسبیح کا مروجہ تصور ہی اسلام کا نہیں تھا۔ صدرِ اول میں اس کا کہیں نشان تک نہیں ملتا۔ یہ بدھ مت والوں (Bud-dhists) کے ہاں تھی۔ ان سے عیسائیوں نے لی' پھر وہاں شام کی خانقاہوں سے مسلمانوں میں آئی اور اب آپ کے ہاں تسبیح اور مصلّٰی عبادت کا ہی نشان بن گیا کہ صاحب! لیے بیٹھے رہو عمل سے غافل'

Marfat.com

نہیں بلکہ عمل سے عاری۔ یہ بڑی عظیم آیتیں ہیں صاحب! تو یہ کہا: اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا(17:78)۔ تسبیح کے اس تصور کے برعکس، غور وفکر کے بعد، مشہود طریقوں سے، یہ بات تمہارے سامنے آجائے گی کہ آج کیا کرنا ہے۔

اہلِ قرآن کے فرقے کا ردِ عمل

میں یہاں ایک چیز عرض کردوں کہ یہ جو ہمارے ہاں پہلے سے ہی مختلف فرقے تھے، ان فرقوں کی پھیلائی ہوئی خلافِ قرآن گمراہیاں کم نہ تھیں۔ یہ ایک چیز تھی قرآن وصلوٰۃ۔ انہوں نے کتاب قرآن کو چھوڑا، سارے جگ میں روحِ قرآن کو چھوڑا، روایات کو لیا، حدیث کو لیا، تفسیروں کو لیا، فقہ کو لیا، ان سے یہ سارے تفرقے، یہ سارا الجھاؤ، اور یہ سب کچھ پیدا ہوا۔ ہمارے دور میں ایک چیز اٹھی جس نے کہا تھا: ''جی! ہم اہلِ قرآن ہیں۔ ہم ان تمام چیزوں کو چھوڑتے ہیں۔ ہم قرآن پہ آتے ہیں صاحب! جب یہ کچھ ہو جائے تو پھر آخری چیز قرآن ہی ہوتی ہے۔ پھر صورت یہ ہوئی کہ آخری چیز جو قرآن رہ گیا تھا، اس کے ساتھ یہ کچھ کیا گیا، جو پہلوں نے بھی نہیں کیا تھا صاحب! آپ کے ہاں اُس نے ایک فکر دی: مولوی عبداللہ چکڑالوی ان کا نام تھا۔ یہ ان کا حدیث کے خلاف ردِ عمل تھا۔ پہلے وہ اہلِ حدیث تھے۔ انہوں نے ان تمام احادیث کو اٹھا پھینکا۔ ان پہ اعتراض ہونے شروع ہو گئے: ان حدیثوں کو نہیں مانتے، تو بتاؤ ہم نماز کیسے پڑھیں گے؟ روزے کیسے رکھیں؟ قربانیاں کیسے دیں؟ انہوں نے کہا: نہیں، حدیث کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ یہ سب قرآن کے اندر موجود ہے۔

ہاں عزیزانِ من! یہ صحیح ہے کہ قرآنِ کریم تو قیامت تک کے لیے، ساری دنیا کے لیے، تمام اقوام کے لیے، تمام ممالک کے لیے، ایک ضابطہ ہدایت ہے۔ لہٰذا جو ایسا ابدی ضابطہ ہو، اس کی صورت ہی یہ ہونی چاہیے کہ اس میں زندگی کے صرف بنیادی اصول ہی دیئے ہوئے ہوں اور اگر ان اصولوں کی جزئیات بھی کسی ایک وقت میں متعین کر دی جائیں، تو زمانے کے حالات تو بدلتے چلے جاتے ہیں تو پھر ان حالات میں ناممکن ہو جاتا ہے کہ ایک وقت کے اندر جو جزئیات Details متعین کی تھیں، وہ ہر دور میں قابلِ عمل ہو سکیں، کیونکہ دوسرے وقت میں تو حالات بدل جاتے ہیں اور اس بنا پر وہ متعین کی گئی جزئیات قابلِ عمل نہیں رہتیں۔ آپ کو کوئی فقہ کی کتاب دی جائے، کوئی مسائل کی کتاب دی جائے، تو وقتی طور پہ تو وہ ٹھیک رہے گی۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ ابدی طور پہ اس کی یہی صورت رہے گی تو پھر تو انسان چل ہی نہیں سکتا۔

اصولوں کی روشنی میں جزئیات خود متعین کرنا ہونگی

قرآن نے قیامت تک کے لیے ضابطۂ حیات دیا، اس نے اصول دیئے ہیں۔ اس کا اسلوب یہ ہے کہ یہ بجز چند احکام کے صرف اصول دیتا ہے۔ ان اصولوں پہ عمل کرنے کے طریقے چھوڑ دیتا ہے۔ وہ ہر دور کی امت سے کہتا ہے کہ اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کو سامنے رکھ کے، جو ان اصولوں پہ عمل پیرا ہونے کا قابلِ عمل طریق ہو، اسے اختیار کر لو۔ یہ اصول تو غیر متبدل رہیں گے، یہ تو قیامت تک

Marfat.com

نہیں بدل سکتے۔ اِن کے اندر رہتے ہوئے تم اس کی جزئیات کا جو طریق اختیار کرو گے' وہ بدلتے جاؤ۔

اس نے کہا: اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (42:38)۔ ان کے معاملات باہمی مشاورت سے طے ہونگے۔ ایک اصول دیا ہے کہ یہاں ڈکٹیٹرشپ (Dictatorship) نہیں ہوگی' مشاورت سے یہ معاملات طے ہونگے۔ مشاورت کا طریق کیا ہوگا؟ مشینری کیا ہوگی؟ یہ مشاورت کیسے ہوگی؟ یہ کچھ اس نے خود نہیں بتایا کیونکہ خود بتایا گیا وہ طریقہ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد نا قابلِ عمل ہو جاتا ہے۔ ایک بستی کے اندر جو طریقہ ہوگا' وہ دوسری میں زمانے کے تقاضوں کی وجہ سے نا قابل عمل ہوگا کیونکہ آج کی دنیا میں جہاں ایک ملک کی آبادی پچاس پچاس کروڑ ہو جاتی ہے' تقاضے بدلتے ہیں۔ اس لیے وہ طریقہ نا قابلِ عمل رہے گا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اصول دیا ہے۔ قرآن نے کہا ہے کہ تمہیں عدل کا حکم دیا جاتا ہے۔ عدل کے لیے کون سا طریق ہوگا' قرآن خود یہ نہیں بتاتا۔ یہ طریق بدلتے چلے جائیں گے' اصول وہی رہے گا۔ مثلاً پنچائیت میں بھی عدل ہو سکتا ہے۔ یہ ہے قرآن کا اسلوب اور یہ اس لیے ہے کہ اس کتابِ عظیم نے آخر تک' آخری انسانوں تک' بطور ضابطۂ حیات رہنا ہے۔ اب کسی اور رسول' نبی نے آنا نہیں ہے' کوئی اور کتاب آنی نہیں ہے اور انسان کی تو ابھی عمر ہی کیا ہے' پتہ نہیں اس نے کہاں تک جانا ہے۔ ابھی تو انسانیت کی جوانی کے ابتدائی دن شروع ہوئے ہیں' تو ان کو اس طرح سے جزئیات کا پابند نہیں کیا جا سکتا۔

جزئیات کے سلسلہ میں مولوی عبداللہ چکڑالوی کی ناکام کوشش

جب جزئیات کے سلسلے میں مولوی عبداللہ چکڑالوی کے ذہن میں ایک نظریہ آیا کہ قرآن کے اندر ایک ایک چیز کی جزئیات موجود ہیں تو اب انہیں قرآن کے اندر ڈھونڈنے لگے۔ قرآن کریم کے اندر تو یہ جزئیات ہیں نہیں۔ تو اب سوچیے کہ اس تلاش کا نتیجہ کیا نکلے گا۔ یہ چھوٹی سی چیز ہے۔ اُن سے پوچھا تھا: نماز کیسے پڑھیں؟ مولوی عبداللہ چکڑالوی صاحب نے کہا کہ سب قرآن کے اندر ہے تو قرآن کے اندر سے نماز کے وقت مقرر کرنے شروع کیے' نماز کی رکعتیں مقرر کرنی شروع کیں' نماز کی جزئیات مقرر کرنا شروع کیں۔ مقرر کرنا ہی نہیں شروع کیا بلکہ تلاش کرنا بھی شروع کیا۔ اب وہ ہوں تو کہیں سے ملیں۔ اب لگے کھینچنے صاحب! اِدھر اُدھر سے آیتیں۔ انہوں نے یہ کہہ دیا کہ چار رکعتیں ہیں' ایک رکعت میں دو سجدے بھی ہوتے ہیں۔ کیا پڑھنا چاہیے؟ اب یہ مشکل پیش آ گئی صاحب! یہ آج کل جو کچھ پڑھا جا رہا ہے' انہوں نے کہا: یہ حدیثوں کی رو سے امت میں چلا آ رہا ہے اور اب انہوں نے نیا تجویز کرنا شروع کر دیا: یہ آیت ہے' یہ پڑھنا چاہیے' یہ یہ پڑھنا چاہیے۔ ارے صاحب! آپ کو یہ اتھارٹی کس نے دی ہے؟ رسول تو یہ کہتا ہے کہ خدا نے کہا ہے: تم یہ کرو۔ اب دوسرا طریقہ مشاورت کا ہے۔ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (42:38)۔ تو اس کو یہ اختیار کس نے دے دیا کہ صبح اٹھ کے کہے کہ آج تو ہماری امت اس طرح کی نماز پڑھے گی۔ او بھئی! تمہیں یہ کہنے کا اختیار کس نے دے دیا؟ میں ایسی نماز پڑھونگا' یہ تمہاری سب

Marfat.com

کی نمازیں باطل ہیں' وہ نماز جو میں کہتا ہوں' وہی صحیح ہے۔ انہیں مرے ہوئے' چار دن ہوئے' ان کے متبعین (Fellowers) یہاں اٹھ کے بیٹھ گئے۔ یہاں' آپ کے ہاں لاہور میں موجود ہیں۔ کہنے لگے: اس نے بھی یہ سب کچھ قرآن سے ہی ثابت کیا تھا۔ بزعمِ خویش یہ پانچ وقت کی نماز' چار رکعتیں' دو سجدے ہیں۔ انہوں نے یہ ثابت کیا کہ نہیں صاحب! یہ غلط ہے۔ انہوں نے کہا کہ قرآن سے تین وقت کی نماز ہے۔ ایک نماز میں دو رکعتیں ہیں' ایک رکعت میں ایک ہی سجدہ ہے' نہ اذان نہ سلام۔ درمیان میں کیا پڑھنا چاہیے؟ ان میں بھی دو فرقے ہوئے۔ ایک فرقے نے ایک ہی نماز بتائی تھی اس میں ایک ہی سجدہ کرنے کو کہا تھا۔ اب ان کے ہاں یہ ایک نماز شروع ہوگئی۔ ان سے پوچھو کہ آپ کو یہ اختیار کس نے دیدیا؟

قرآن کو سب سے زیادہ نقصان' اہلِ قرآن نے پہنچایا

میں کہہ رہا تھا کہ جتنا نقصان انہوں نے قرآن کو پہنچایا ہے' اس سے پیشتر ہزار سال میں کسی نے نہیں پہنچایا تھا۔ ان کے ہاں اگر اختلاف ہوتا تھا تو اس بات پہ کہ صاحب! اس حدیث میں یہ آیا ہے' اُس حدیث میں یہ آیا ہے۔ حدیثوں میں اختلاف تھا' فلاں امام کا یہ قول ہے' دوسرے امام کا یہ قول ہے۔ یہ فکر انسانوں کی ہے' خدا کی بات تو نہیں تھی۔ یہاں اُن کا ایک شخص یہ کہہ رہا ہے' جن کے یہ متبع ہیں: پہلا ہی ان کے ہاں کا امام کہ قرآن کی رو سے خدا نے فرمایا ہے: قرآن شریف سے چار رکعتیں اور دو سجدے ہیں۔ اسی کے متبعین کہتے ہیں: خدا نے قرآن میں یہ کہا ہے کہ تین وقت نماز اور دو رکعتیں اور ایک سجدہ ہے۔ تو اب قرآن کے متعلق یہ جتنے بھی غیر مسلم ہیں کیا خیال کریں گے؟ قرآن میں خدا نے کہا تھا کہ قرآن کے منجانب اللہ ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں آئے گی۔ تم اس میں کوئی بات بھی متضاد نہیں پاؤ گے۔ تو یہی قرآن پانچ وقت بھی بتائے اور یہی قرآن تین وقت بھی بتائے' یہی قرآن آپ کو چار رکعتیں بتائے' یہی قرآن دو رکعتیں بتائے' یہی قرآن ایک رکعت میں دو سجدے بتائے' یہی قرآن ایک سجدہ بتائے' یہی قرآن یہ کچھ پڑھنے کے لیے بتائے' یہی قرآن یہ کچھ پڑھنے کے لیے بتائے۔ آپ سوچیے! اس قرآن کے متعلق دوسروں کے ذہن میں کیا آئے گا۔ اب تک تو بچت کی صورت یہ ہوتی تھی کہ جب بھی وہ مسلمانوں کے اختلافات کو گناتے تھے تو ان سے کہا جاتا تھا کہ صاحب! یہ اختلافات ان وضعی روایات نے پیدا کیے ہیں' فقہ نے پیدا کیے ہیں' انسانوں کی فکر نے پیدا کیے ہیں' تو خدا تو بچا رہتا تھا' قرآن تو محفوظ ہوتا تھا۔ اب وہ بھی ختم ہوا۔ کہا یہ ہے کہ قرآن سے یہ ثابت ہے۔

نماز کے بعد حلال و حرام کا قصہ

یہ تو میں نے ایک نماز کا کہا ہے۔ یہ حلال ہے' وہ حرام ہے' یہ جائز ہے' وہ ناجائز ہے۔ اس کی تو انہوں نے ایک لسٹ مرتب کی ہے تو دوسرا اسی قرآن سے ایک دوسری لسٹ مرتب کیے چلا جا رہا ہے:

اک دسترس سے تیری' حالی بچا ہوا تھا ❶
اس کے بھی دل پہ آخر چرکا لگا کے چھوڑا (حالی)

❶ مولانا الطاف حسین حالی (1837-1914ء)

Marfat.com

قرآن وہ کتاب مبین ہے کہ جس میں کوئی تضاد نہیں

ان مسلمانوں کے ہاتھوں سے خدا کی یہ کتاب بچی ہوئی تھی۔ ہمارے دور میں آ کے اس کو بھی انہوں نے ختم کر دیا۔ عزیزان من! سوچیے کہ قرآنِ کریم کے اندر جو کچھ دیا ہوا ہے' اگر وہ جزئیات یا Details دی ہوئی ہیں تو وہ اتنی صاف اور واضح ہونگی کہ ہو ہی نہیں سکتا کہ دو شخص اسی قرآن سے ان کو الگ الگ لیں۔ قرآن دو قسم کی متضاد چیزیں دے ہی نہیں سکتا۔ اگر اس نے یہ بات کہی ہے کہ دو بہنیں بیک وقت ایک کے نکاح میں نہیں رہ سکتیں' اس قرآن میں سے ہزار آدمی ہزار مختلف جگہ دیکھے گا' یہی بات ملے گی۔ اگر اس نے یہ کہہ دیا ہے کہ ورثہ میں فلاں کا اتنا حصہ ہے' لاکھ آدمی' لاکھ مقام پہ اس قرآن کو دیکھیں انہیں یہی ملے گا' یعنی جس بات کی اس قرآن نے خود تفصیل دی ہے اس میں کسی صورت میں تضاد ہو ہی نہیں سکتا۔ اگر اس میں تضاد واقع ہو جائے تو معاف رکھیے گا' اس سے زیادہ ناقص کتاب دنیا میں کون سی ہو سکتی ہے اور وہ کتاب کہ جو یہ نہ بتا سکے کہ پانچ وقت کی نماز ہے یا نماز کے تین وقت ہیں' اسی سے ایک پانچ ثابت کرے' اسی سے ایک تین ثابت کرے تو اس خدا کے متعلق کیا تصور ہوگا۔ یہ ہے اس قرآن کے متعلق آپ کا دعوٰی کہ یہ انسانوں کے لیے قیامت تک ضابطہ ہدایت ہے اور اس کی کیفیت یہ ہے کہ اس سے یہ بھی پتہ نہ چلے کہ پانچ وقت کی ہے یا تین وقت کی' ایک نماز میں دو رکعتیں ہیں یا چار رکعتیں' دو سجدے یا ایک سجدہ۔ خدا کو یہ بھی کہنا نہیں آتا۔ معاذ اللہ معاذ اللہ۔ یہ ہے وہ چیز جس کا نام آپ اہلِ قرآن کہہ رہے ہیں۔ ہم ''صرف قرآن سے یہ سب چیزیں ثابت کرتے ہیں۔'' اس طرح تو یہ سمجھ ہی نہیں سکے کہ قرآن ہے کیا؟

دراصل یہ قرآن فکر (Thought) کی بڑی بلند سطح چاہتا ہے' عزیزانِ من! جب ان لوگوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ سکی تو قرآن سے جزئیات نکالنے لگے۔ تباہ کر کے رکھ دیا' ہمارے پاس قرآن ہی ایک بچی ہوئی چیز تھی' پوچھیے ان کو کہ وہ کیا چاہتے ہیں؟ آپ کے مخالفین قرآن کے متعلق کیا کیا کہہ رہے ہیں۔ وہ نکتہ چیں اس بات کے اوپر کیا کہہ رہے ہیں کہ آج تک تو آپ ہمیں یہ کچھ کہتے تھے کہ صاحب! یہ اختلاف ان لوگوں کا پیدا کردہ ہے۔ خدا کی کتاب وہ ہے کہ جس میں کوئی اختلافی بات نہیں ہے۔ اب خدا کی یہ کتاب تمہارے ہاں یہ بتا رہی ہے' اسے یہ بھی نہیں کہنا آتا کہ ایک رکعت میں دو سجدے ہیں یا ایک سجدہ ہوتا ہے۔ ٹھیک ہے' جو کسی کے جی میں آئے کہے' میں زیادہ تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ یہ سب کچھ طلوعِ اسلام [1] میں بھی آ گیا ہے۔

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) لاہور کی طرف سے شائع کردہ ''قرآنی فیصلے جلد اول (ایڈیشن سوم۔ مارچ ۱۹۹۲ء۔ بلا ترمیم) اور ''قرآنی فیصلے'' کی ہی جلد دوم ایڈیشن سوم۔ دسمبر ۱۹۹۳ء۔

Marfat.com

قرآن یہاں تو نظامِ صلوٰۃ کی بات کرتا ہے

میں یہ بات اس لیے کہہ رہا تھا کہ اسی آیت (17:78) سے بھی وہ نمازیں ثابت کرتے ہیں۔ وہ پانچ وقت کی نماز والا بھی اسی سے ثابت کرتا ہے' تین وقت کی نماز والا بھی اسی سے کرتا ہے۔ اب یہ کیسے کرتے ہیں؟ دیکھیے' وہ کہتے ہیں کہ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ (17:78)۔ ایک نماز فجر ہوگئی۔ اس نے کہا: طلوعِ شمس سے غسق الیل تک۔ یہ چار اور ہوگئیں۔ انہوں نے کہا: نہیں' دو اور ہوگئیں۔ صاحب! اب یہ چیز لمبی بحث میں چلی جائے گی۔ آپ ''لغاتِ قرآن'' سے دیکھ لیجیے کہ ''دلوک'' کے معنی کیا ہیں اور ''غسق'' کے معنی کیا ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں: ''طلوعِ آفتاب سے رات شام تک کا پورا وقت۔'' اس کے لیے نماز کے یہ اوقات ہیں ہی نہیں۔ یہاں اقیموا الصلوٰۃ یعنی نماز کے اوقات نہیں دیئے ہوئے۔ یہاں نظامِ صلوٰۃ دیا ہوا ہے اور کہا یہ گیا ہے کہ اب تو اس پروگرام میں یہ ایک گھڑی ایسی آ گئی ہے جس کے لیے پورا وقت اسے دینا پڑے گا۔ مخالفتیں یورش کر کے آ گئیں۔ جب مفاہمت یا Compromise کی بھی جو کوششیں ہوتی ہیں ناکام رہ جاتی ہیں۔

قرآنی نظام کو مستحکم کرنے کے لیے صبح و شام سرگرمِ عمل رہو

عزیزانِ من! اس پروگرام کے اندر بڑی سخت نازک گھڑیاں آتی ہیں اور جب ان کی سازش میں پروگرام یہ ہو کہ انہیں یہاں سے نکال باہر کیا جائے' تو اس لیے اب تو اور مشکل وقت آ گیا ہے۔ پہلے بھی تم اس میں سرگرمِ عمل رہنے کی کچھ کمی نہیں کر رہے تھے اور اب تو یہ ہے کہ صبح سے شام تک پورا وقت اس کے لیے دینا پڑے گا۔ صبح اٹھو تو پہلے قرآن سے یہ دیکھو کہ آج یہ ہدایت دیتا ہے' اب کیا کرنا چاہیے اور پھر دلوک الشمس سے غسق الیل تک' صبح سے شام تک' ہمارے ہاں بھی محاورۃً کہتے ہیں کہ صبح سے شام تک تمہیں یہ کام کرنا چاہیے۔ اس کے معنی ہوتا ہے: مسلسل کرنا چاہیے۔ اب تمہیں لگاتار یہ کرنا چاہیے: صبح صبح اٹھو اور باہمی مشاورت کرو۔ پھر صبح سے شام تک یہ کرو اور یہ سب کچھ کر کے گھروں کو چلے جائیں۔ ان سے کہو کہ جاؤ تم آرام کرو' تمہیں پھر بھی کچھ اور جاگنا پڑے گا۔ تو یہ لوگ کچھ اور بھی ''جاگنا پڑے گا'' سے یہاں تہجد کی نماز لیتے ہیں۔ فَتَهَجَّدْ بِهٖ (17:79)۔ تو میں نے کہا ہوا ہے کہ قرآن کے کسی ایک لفظ پہ بھی آ کے یوں نہ بیٹھ جایئے' کھڑے ہو جایئے وہاں ''تہجد'' تو ٹھیک ہوگیا ''جاگنا'' ہے۔ یہ بہٖ کیا ہے؟ وہاں تو ''قرآن الفجر'' ہے۔ انہوں نے آنا ہے' آپس میں مشورہ کرنا ہے۔ یہ کچھ کرنے کے بعد بھی اس کو لے کے بیٹھ جا نَافِلَةً (17:79)۔ اس پروگرام میں تیری ذمہ داریاں زیادہ ہیں۔ یہ اضافہ ہیں جو ہم تمہیں دے رہے ہیں۔ صبح اٹھ کے انہوں نے آنا ہے۔ قرآن کے متعلق مشورہ کرنا ہے تو پہلے سے ہی رات اس کو لے کے بیٹھ جا: یہ تھی عزیزان من! تہجد' اب ہمارے ہاں تہجد گذار ہے اور تہجد کے بعد تسبیح پھیرتے ہیں۔ کیا کیا بتایا جائے۔ سنیے! یہ پروگرام تھا۔ دین کا نظام یونہی قائم نہیں ہو جاتا۔ نمازیں پڑھنے سے ہو جاتا تو بگڑتا ہی کچھ نہیں۔

جن کے رتبے ہیں سوا اُن کی سوا مشکل ہے۔

میں نماز کا استحصال نہیں کر رہا

میں پھر عرض کر دوں کہ کہیں یہ نہ سمجھ لیجیے کہ میں نماز کا استحصال کرتا ہوں۔ صلوٰۃ کے یہ اجتماعات بڑے ضروری ہیں۔ کوئی پروگرام نہیں چل سکتا جب تک کہ آپ اس کے سوچ وبچار کرنے کے لیے اجتماعات مقرر نہ کرلیں۔ میں ابھی عرض کرونگا کہ پھر اوقات کی کیا صورت ہوگی۔

لفظ مزمل کا مفہوم

یٰۤاَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ (73:1)۔ ہمارے ہاں اس کا ترجمہ ''او کملی اوڑھنے والے پیارے اٹھو''! کیا جاتا ہے۔ جو مزمل آیا ہے اس کا ترجمہ ''کملی اوڑھنے والے'' کیا جاتا ہے۔ پوچھیے عربوں سے کہ وہ لفظ ''مزمل'' کس طرح استعمال کرتے تھے۔ ان کے ہاں تو ہمیشہ سفر کے لیے قافلے چلتے تھے۔ اونٹوں کے قافلے ہوتے تھے۔ اونٹوں کے قافلے میں بوجھ لادنے اور سواریاں بٹھانے کے لیے دیکھنے کی پہلی چیز یہ ہوتی ہے کہ بوجھ اس طریقے سے لدا ہوا ہے کہ اسمیں دونوں طرف عدل قائم ہے' دونوں طرف کے بوجھ میں توازن قائم ہے' ایک طرف سے جھکا ہوا نہیں ہے اور دوسری طرف سے اٹھا ہوا نہیں ہے اور ان کی رسیاں ٹھیک بندھی ہوئی ہیں۔

کجاوے میں بیٹھنے والی سواریوں کی خصوصیت

یہ بھی دیکھنا ہے کہ چلتے ہوئے سامان اِدھر اُدھر تو نہیں گر جائے گا۔ اونٹ کے ایک کجاوے میں دو دو سواریاں بیٹھی ہوتی تھیں۔ سواریوں کے متعلق بھی وہ دیکھتے کہ آیا وزن کے اعتبار سے ہم وزن ہیں اور اس کے بعد یہ کہ ان سواریوں نے بالآخر بت بن کے تو بیٹھے نہیں رہنا' آپس میں باتیں بھی کرنی ہیں' مشورے کرنے ہیں۔ دونوں سواریوں کا ہم رنگ' ہم مزاج' ہم آہنگ ہونا بھی ضروری ہے۔ آپ کے ہاں صاحب! ریل کا سفر کرتے ہیں اگر کہیں دوسری ناجنس سواری' اسی صوفے میں بیٹھی ہو تو یہ اس کے لیے عذاب ہو جاتا ہے۔ میر تقی میر (1721-1810) تو آدھے ہی راستے میں ایک دن اتر بیٹھا تھا۔ اس زمانے میں یکے [1] چلتے تھے۔ دہلی کا یکہ لیا۔ غریب تھے' سالم یکہ تو لے ہی نہیں سکتے تھے۔ اسمیں بھی دو سواریاں بیٹھتی تھیں۔ ان میر تقی میر صاحب کے ساتھ ایک اور سواری بیٹھ گئی۔ اب وہ چل پڑا۔ راستے میں اس نے اپنی ''کرخنداری تکان'' شروع کی۔ میر تقی میر صاحب زبان کے معاملے کے اندر اتنے نازک مزاج تھے کہ ذرا سا کہیں تلفظ بگڑا تو ان کے ماتھے پہ شکنیں پڑنے لگیں ــــ وہ کرخندار' جو ساتھ بیٹھا ہوا دیہاتی ذرا زبان دراز تھا۔ میر تقی میر صاحب کہنے لگے: آپ مجھ سے یہ پورے کا پورا کرایہ لیں' خدا کے لیے مجھے اتار دیجیے۔ یکے والا کہنے لگا کہ جی! کیا ہوا؟ اور یکہ تو چل پڑا۔ ''اچھا چل رہا ہے۔''

---

[1] ایک گھوڑے کی رتھ نما گاڑی' یکّا (ایک گھوڑے کی گاڑی)' تانگا۔

Marfat.com

کہنے لگے: ''میں تمہارے یکے کے متعلق نہیں کہہ رہا' گھوڑے کی بات نہیں کر رہا' یہ جو ''ساتھ'' آپ نے مجھے باندھ دیا ہے' میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ اگر یہ آگے تک رہا تو ساری زندگی کی' جتنی شاعری میں نے کی ہوئی ہے' سب ختم ہو جائیگی۔ اس کمبخت کی زبان وہ سب کچھ تباہ کر جائیگی۔ میں اس سطح کے اوپر سفر نہیں کرنا چاہتا۔'' عزیزانِ من! صحبتِ ناجنس سے یہ چیز ہوتی ہے۔ کسی ایک اونٹ کی سواری کے ساتھ اس قسم کے میر تقی میر اور اس کے ساتھ اس قسم کے کرخندار کو بٹھا دیا' تو دیکھیے پھر ہوتا کیا ہے؟ تو اِسے بھی سالارِ کارواں کو دیکھنا چاہیے۔

یہ جو میر کارواں ہوتا ہے' جو قافلۂ سالار ہوتا ہے' اس کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ یہ بھی دیکھے کہ میرا قافلۂ اونٹ' جو چل رہا ہے' اس میں سب ٹھیک ہیں' سامان درست ہے' خاص طور پر یہ جو سواریاں بیٹھ رہی ہیں' یہ ایسے انداز کی ہیں کہ انکا سفر اس طرح سے کٹے کہ ان میں موافقت ہو' مطابقت ہو۔ چنانچہ اس عمل کے لیے جو کچھ قافلۂ سالار کو کرنا پڑتا تھا' اسے عرب والے ''عملِ ترمیل'' کہتے تھے اور جو سالارِ کارواں اس قسم کے چناؤ میں بہت زیادہ ماہر Expert ہوتے ہیں' انہیں وہ مرتل کہتے ہیں۔ کہا ہے: یٰٓاَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ (73:1)۔ اے کاروانِ انسانی کو منزلِ مقصود تک باحفاظت لے جانے والے ذمہ دار! یہ ہے حضور کا مرتبہ' یہ تھی ذمہ داری' یہ تھا مزمل! اور پھر ایسے ایسے قافلے تیار کیے۔ عزیزانِ من! کہ جہاں پھر کہیں اختلاف نہ ہوا' کہیں تضاد نہ ہوا' کہیں آپس میں مزاحمت نہیں ہوئی۔ رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ (48:29)۔ آپس میں بڑے ہی نرم دل اور ہمدرد کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ یہ تھا مرتل۔

قافلے میں چلنے والے مسافروں کی ذمہ داری بڑی تھوڑی سی ہوتی ہے۔ وہ اپنے ہی لوٹے' اپنے ہی بستر' اپنا ہی کچھ توشہ باندھتے ہیں۔ بس ان کی اتنی ہی ذمہ داری ہوتی ہے۔ باقی سارا کچھ قافلۂ سالار کے سر ہوتا ہے۔ اسکو تو بڑی فکر ہوتی ہے۔ پتہ نہیں اسے کتنا انتظام کرنا ہوتا ہے۔ یہ تھی وہ جماعت۔ یہ تھا تشکیلِ جماعت کا اولیں مرحلہ' جسمیں عملی ترمیل یوں کرنا پڑ رہی تھی۔ دن بھر یہ سارے قافلے کی دیکھ بھال اور جب قافلے والے آرام سے سو جائیں تو پھر یہ ترمیل والا بیٹھ جاتا ہے۔ دیکھتا ہے کہ کہاں نقص رہ گیا ہے' مجھے کیا کرنا ہے' کل کا پروگرام کیا ہے' کیسے طے کرنا ہے؟ یہ سارا کچھ کرنے کے لیے وہ ساری ساری رات جاگتا رہتا تھا۔ آپ نے منبروں Pulpits سے سنا ہوگا کہ صاحب! ساری رات عبادت میں کھڑے رہتے تھے' پاؤں سوج جایا کرتے تھے۔ ان کے ذہن میں اس کے سوا کچھ اور آتا ہی نہیں ہے۔ جب بھی ان کے ہاں پوچھیے' کہتے ہیں: صاحب! بڑا عبادت گذار ہے۔ اسکے معنی ہیں کہ رات بھر نفل پڑھتا رہا ہے۔ عبادت کے اندر اطاعت احکام اور خداوندی محکومیت کا تو تصور ہی نہیں ہے۔ رسول اللہؐ ساری ساری رات کھڑے رہتے تھے۔ کیا کرتے تھے؟ نفل پڑھتے رہتے تھے اور کچھ پتہ نہیں۔ اُف! ہم کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔

Marfat.com

ہمارے ہاں عبادت کا مفہوم اور حضورِ اکرمؐ کی مصروف زندگی

قرآن نے بتایا ہے: یٰٓاَیُّھَا الْمُزَّمِّلُ (73:1)۔ دیکھیے مخاطب کس بات پہ ہو رہا ہے؟ حضورؐ کی کئی اور صفات بھی تھیں، مگر یہ تو وہ تھے کہ جسے اتنا بڑا کارواں تیار کرنا ہے! اب کچھ سوچنا پڑتا ہے، دن بھر کے تھکے ماندے قافلے والے سو گئے۔ یہ ہے جو جاگ رہا ہے۔ ایسا نظر آتا ہے جیسے کہ وہ مشفق ماں کمرے کے باہر سے گذرے اور امتحان دینے والا بچہ، جو دن بھر اور آدھی رات تک بیٹھا ہو: ''او ننھے تو ابھی تک جاگ رہا ہے۔ او بیٹا! سو بھی جا، تھوڑے وقت کے لیے، صبح تم نے امتحان دینا ہے۔'' کہا: ''امی! میں اسی لیے تو جاگ رہا ہوں۔''

یٰٓاَیُّھَا الْمُزَّمِّلُ قُمِ الَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًا (73:2)۔ اے مزمل! تجھے ۔ کو جاگنا تو پڑتا ہے، جاگا کر، بھئی! تھوڑا جاگا کر، صرف آدھی رات تک جاگ لیا کر، اس کے بعد کچھ سو لیا کر، کچھ آرام کر لیا کر، اس لیے کہ اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْکَ قَوْلًا ثَقِیْلًا (73:5)۔ تیرے سامنے بڑا بھاری پروگرام ہے، بڑا مشقت طلب پروگرام ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ راتوں کا جاگنا سہل انگاری کے جذبات پر قابو پانا ہے۔ اِنَّ نَاشِئَةَ الَّیْلِ ھِیَ اَشَدُّ وَطْاً وَّاَقْوَمُ قِیْلًا (73:6)۔ اس سکوت میں سکون سے بڑے اچھے اچھے پروگرام بنتے ہیں لیکن یہ بھی تو سوچ کہ اِنَّ لَکَ فِی النَّھَارِ سَبْحًا طَوِیْلًا (73:7)۔ ارے دن بھر بھی تو تیرے سامنے سارے دن کا جو پروگرام ہے، بڑا لمبا پروگرام ہے، وہ بھی تو تم نے ہی پورا کرنا ہے۔ یہ تھا پروگرام عزیزانِ من! وَمِنَ الَّیْلِ فَتَھَجَّدْ بِہٖ نَافِلَةً لَّکَ (17:79)۔ یہ پروگرام قرآن الفجر سے شروع ہوا، دلوک شمس سے غسق الیل تک پورے کا پورا یہ پروگرام رہا۔ یہ تھے مزمل کے معنے۔ یہیں سے آگے ایک عالمگیر انقلاب کا پروگرام ہے جو تیرے پیشِ نظر ہے، جو تجھے برپا کرنا ہے۔

سورۃ المزمل کی ایک دو آیتیں اور بھی تو دیکھ لیجیے۔ بڑی عجیب چیزیں ہیں۔ قرآن انسانی مزاج و طبائع پر کتنی رعایت برتتا ہے! حقائق پہ نگاہ رکھتا ہے۔ کہتا ہے کہ تیرے ساتھ یہ جو قافلے والے چل رہے ہیں، کبھی ان کی کیفیت بھی دیکھی ہے۔ وَطَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِیْنَ مَعَکَ (73:20)۔ او بھئی! ایک گروہ جو تمہارے ساتھ ہے، ان کی کیفیت یہ ہے کہ مِنْکُمْ مَّرْضٰی (73:20)۔ ان میں کمزور بھی ہیں، کچھ ان میں مریض بھی ہو سکتے ہیں۔ یہ مختلف انداز کے ہیں۔ اگر یہ چیز سب کے لیے مقرر کر دی جائے کہ دن بھر اس مسافت میں، اس پروگرام میں، اس طرزِ عمل میں، رات بھر یہ کچھ کرنے کے لیے کہا جائے، جاگا جائے، تو مشکل ہو جائے گی۔ اس لیے رات بھر ان کے لیے یہ نہ کہا جائے اور پھر دوسری بات یہ کہ تمہیں، تمہارے دوستوں میں دیکھ دیکھ کے یہ بھی یہی کچھ کرنے لگ جائیں تو یہ کام نہیں چل سکے گا۔ یہ قرآن کہہ رہا ہے۔ جماعت میں مختلف قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ ان کا بھی خیال رکھو۔ تم جاگو گے تو یہ بھی جاگنا شروع کر دیں گے۔ تھوڑے وقت کے لیے سو جایا کرو، ان کو بھی سو جانے دیا کرو، صبح اٹھ کے پھر کوشش شروع کر دیا کرو۔ یہ تھا جو یہاں کہا گیا۔

Marfat.com

امت کے باہمی مشورے کی اہمیت

میں اتنی بات عرض کردوں کہ قرآنِ کریم نے متعین طور پر یہ چیز' یہ مکینزم Mechanism' یہ طریق کار' یہ کچھ کرنے کا ڈھانچہ خود تجویز نہیں کیا' یہ امت پر چھوڑا ہے لیکن یہ بھی کہہ دوں کہ یہ کچھ کرنا انفرادی چیز نہیں ہے۔ اس کا حق کسی پرویز کو' کسی عبداللہ چکڑالوی کو' کسی محمد علی کو' نہیں دیا گیا۔ اگر یہ حق اس طرح کسی کو دے دیا جائے تو اتنا خلفشار پیدا ہو جائے صاحب! کہ بس میں اپنے طریقے کی نماز پڑھوں۔ وہ اس کے طریقے کی نماز پڑھے۔ وہ اس طریقے کی نماز پڑھے۔ ہم میں سے ہر ایک یہ کہتا ہوا سنائی دے کہ صاحب! یہ خدا کی تجویز کردہ ہے۔ آپ کے ہاں یہ کہنے والا تو ایک آیا تھا کہ خدا نے یہ کہا ہے۔ اب آپ نے دیکھا کہ اس زمانے میں قادیانیوں نے کتنا خلفشار مچا دیا۔ وہ خلفشار یہی کہہ کے مچایا کہ ''خدا نے یہ کہا ہے''۔ وہ بھی اگر یہ کہتا کہ ''صاحب! یہ میرا اپنا خیال ہے'' تو ہم کہتے کہ ''ہوتا رہے تمہارا خیال'' کیا تمہارا خیال' ہم پہ کوئی Binding ہے؟ یہ بات کہ ''خدا نے ایسا کہا ہے'' بڑی دوررس نتائج کی بات ہے۔ انہوں نے یہ کہا کہ خدا نے کہا ہے کہ یہ چار رکعتیں ہیں۔ خدا نے کہا ہے کہ دو رکعتیں ہیں۔ خدا نے کہا ہے کہ دو سجدے ہیں۔ خدا نے کہا ہے کہ ایک سجدہ ہے۔ اور اگر یہ اختیار ہر ایک کو دے دیا جائے' تو اس صورت میں ہر ایک کو اختیار ہوگا کہ جو چاہیں کہیں یا کریں' آپ انہیں کیسے روک سکتے ہیں۔ تو آپ سوچیے کہ یہاں کیا کچھ ہو جائے' خواہ وہ ڈیڑھ اینٹ کی اپنی الگ مسجد ہو۔ وہ انہوں نے بنا تو لی ہے امت میں خلفشار مچ گیا ہے۔ تو سوال یہ ہے کہ یہ کس کا فریضہ ہے؟ یہ کس کا حق ہے؟

یہ خلافت علیٰ منہاج رسالت کا ہی فریضہ ہوگا

اس لیے عزیزانِ من! یہ بات سن رکھیے' یہ بات جو میں کہہ رہا ہوں۔ میرا مسلک یہ ہے کہ یہ چیز صرف خلافت علیٰ منہاج رسالت جسے اسلامی مملکت کہتے ہیں' کا حق اور اختیار ہے۔ قرآن نے جو کہا ہے کہ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (42:38)۔ تمام امور کے فیصلے قوانینِ خداوندی کی حدود میں رہتے ہوئے' باہمی مشاورت سے ہونے چاہئیں تو یہ ان سے کہا ہے: اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ (22:41)۔ جنہیں زمین میں تمکن حاصل ہوگا' زمین میں مملکت حاصل ہوگی۔ یہ جو اس مملکت کے اربابِ حل وعقد ہونگے' یہ جو جماعت ہوگی' یہ حق اس کو حاصل ہوگا اور اس کو بھی یہ حق خود نہیں ہوگا بلکہ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (42:38)۔ امت کے مشورے سے یہ لوگ اس بات کو طے کرینگے کہ نماز کے اجتماعات کا کونسا وقت ہونا چاہیے' کیا Details ہونی چاہئیں' کیا طریق ہونے چاہئیں۔ یہ ان کا فریضہ ہے کہ وہ یہ کچھ کریں۔ یہ ٹھیک ہے کہ یہ اہلِ قرآن والے' یہ اعتراض کرنے کے لیے جنہیں نہ سمجھ ہے' نہ بُوجھ ہے' بس یونہی بیچاروں نے کہہ دیا کہ جی! قرآن نے کہا ہے۔ اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا (4:103)۔ صلوٰۃ تو ایک موقت فریضہ ہے جس میں وقت پر شریک ہوا جائے۔ ٹھیک ہے' کتابِ موقوت ہے' اس کا قانون ہے' جو وقت اس کے لیے مقرر کیا جائے گا

Marfat.com

اس میں تم کو آنا پڑے گا۔ نظام چلتے ہی اسی طرح سے ہیں۔ اس نظام میں باہمی مشاورت سے اجتماع کا جو وقت طے کر لیا تو وہ اس اجتماع کے لیے مقرر وقت ہوگا۔ قرآن نے تاکید کی ہے کہ یاد رکھو کہ جب اس کے لیے وقت کا تعین کر دیا جائے تو اس وقت پر تمہیں اس میں جانا ہوگا۔ یہ نظام چل ہی اس طرح سکتا ہے۔ یہ کتابِ موقوت ہے۔ یہ نہیں ہے کہ ہم اپنے طور پر کہیں کہ کوئی بات نہیں صاحب! وہ وہاں کا اجتماع ہوتا رہے: ''اسیں اپنے گھر اچ ای چار بندے جمع ہو جانے ہیگے آں' کوئی گل نہیں' اللہ اللہ ای کرنا اے ناں' اللہ اللہ تسی کلے وی کر سکدے او جنگل اچ وی کر سکدے او''[1]

اس وقت اسلامی مملکت کی غیر موجودگی میں ہمیں کیا کرنا ہوگا؟

یہ کتابِ موقوت ہے۔ اور یہ وہ چیز ہے' اسے سن رکھیے جو میں کہتا ہوں' اب جبکہ وہ خلافت علیٰ منہاج رسالت نہیں ہے' اب جبکہ اسلامی مملکت کہیں نہیں ہے' اس وقت امت کیا کرے؟ یا تو یہ انتشار پیدا کرے کہ ہر ایک کو اختیار دیدے کہ صاحب! جس نے کہا ٹھیک ہے' وہ اپنے طور پر کہہ لیجیے صاحب! کہ قرآن سے یہ ثابت ہو گیا ہے اور کرتے چلے جایئے۔ اس سے اتنا انتشار' اتنا خلفشار مچ جائے گا کہ امت کے اندر دو آدمی بھی اکٹھے نہ رہ سکیں گے۔ میں نے قرآن سے یہ مقصد لیا ہے کہ بھئی! اب جب کہ صورت یہ ہے کہ وہ نظام قائم نہیں ہے تو یہ امت جس طریق سے کرتی چلی آ رہی ہے' اس کو اسی طرح سے قائم رکھا جائے' اس میں کوئی تبدیلی نہ کی جائے۔ اپنے اپنے طریقے کو مختلف فرقے ہی سہی' ایک فرقے کے لوگ تو بہر حال اپنے کسی مقام پر ہم رنگ ہیں' تم نے اگر اور شروع کیا تو ایک نیا فرقہ وجود میں آ جائے گا۔ امت کی وحدت تو پہلے ہی ختم ہو چکی ہے' تم اس میں اور اضافہ کرتے چلے جاؤ گے۔ میرا مقصد یہ ہے' سن رکھیے کہ جس جس طریق سے امت ان چیزوں پہ عمل پیرا ہوتی چلی آ رہی ہے' بشرطیکہ اس میں سے کوئی بات قرآن کے خلاف نہ جاتی ہو' اسے کرتے چلے جایئے۔ لیکن بہر حال یہ جو کوئی نماز روزے وغیرہ کے طریقے یا جزئیات ہیں' جن پہ مسلمانوں کے مختلف فرقے عمل پیرا ہیں' ان میں کوئی بات شرک کی تو ہے نہیں۔ یہ تو ہے نہیں کہ کسی ایک فرقے نے بت سامنے رکھ کے اس کو پوجنا شروع کر دیا ہے۔ اتنا سا ہی فرق ہے کہ کوئی ہاتھ یہاں باندھ لیتا ہے' کوئی یہاں باندھ لیتا ہے' کسی کا وقت ذرا پہلے شروع ہو جاتا ہے' کسی کا ذرا بعد میں شروع ہو جاتا ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ تم ان میں سے کسی سے بھی مخالفت نہ کرو' کوئی جھگڑا نہ پیدا کرو۔ تم جس فرقے میں پیدا ہوئے ہو' وہ جس قسم کا تمہارا جی چاہتا ہے اس کے مطابق تم ان کو ادا کرتے چلے جاؤ۔ کوئی نیا طریقہ وضع نہ کرو' موجودہ طریقوں میں کوئی تبدیلی پیدا نہ کرو' ایسا کرنے سے انتشار پیدا ہو جائے گا۔ اسی طرح سے یہ کرتے چلے جاؤ۔ ابتداء میں ہو سکتا ہے کہ حضور نبی اکرمؐ کے زمانے میں بھی یہ چیز

---

[1] ہم اپنے ہی گھر میں چار افراد جمع ہو جاتے ہیں۔ یہ اجتماع کی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ کو تو اللہ اللہ ہی کرنا ہے نا' یہ تو آپ اکیلے ہی کر سکتے ہیں۔ کوئی بات نہیں یہ اللہ اللہ تو آپ جنگل میں بھی کر سکتے ہیں۔

Marfat.com

چلی ہو' اسی طرح یہ مقرر کئے گئے ہوں۔ جس طرح سے بھی یہ ہوئے ہیں' یہ ان چھوٹے چھوٹے پیمانے پہ فرقے ہیں' فرقوں کے اندر کچھ تو وحدت باقی ہے۔ اس میں مزید خلفشار نہ پیدا کرو۔ تو یہ ہے میرا مقصد کہ ان میں کوئی تبدیلی نہ کرو' اسی طرح سے رہنے دو لیکن ان میں باہمی مناظرے' مباحثے' جھگڑے' فساد' برپا نہ کرو۔ قطعاً ایسا نہیں ہے کہ ہاتھ باندھنے والا کافر اور ہاتھ چھوڑنے والا کافر' یہ دونوں مسلمان ہیں۔ یہ ہے جو میں تبلیغ کرتا ہوں' جو میں تلقین کرتا چلا آ رہا ہوں۔

لاہور میں اردو میں نماز: ایک نیا فتنہ

جہاں بھی کوئی نئی بات وضع کرتا ہے میں سب سے پہلے اس کی مخالفت کرتا ہوں۔ یہاں لاہور میں ہی ایک شخص نے شروع کر دیا کہ نماز اردو میں بھی ادا کی جا سکتی ہے۔ میں نے کراچی میں بیٹھے ہوئے' اس کے خلاف قدِ آدم پوسٹر لاہور میں لگوائے کہ نیا فتنہ پیدا ہو رہا ہے' اس کو روکیے' حالانکہ وہ کہنے والا ذاتی دوست تھا۔ سب سے پہلے میں نے اس کی مخالفت کی۔ میں نے کہا: امت میں ایک اور فتنہ کھڑا ہو گیا۔ کیا پہلے ہی ہم ان کے ہاتھوں سے کچھ کم دکھے ہوئے ہیں' جو یہ نیا فرقہ بن گیا ہے؟ ہم فرقہ بندیوں کے ہاتھوں سے صدمے اٹھا رہے ہیں' اب یہ ایک اور فرقہ پیدا ہوا ہے۔

قرآن کے الفاظ کا کوئی متبادل نہیں

میں نے یہ لکھا کہ نماز میں قرآن کے الفاظ دہرائے جاتے ہیں۔ قرآن عربی زبان کے اندر ہے۔ عربی زبان کے قرآن کے الفاظ کا متبادل کسی زبان میں نہیں ہو سکتا۔ اردو زبان میں نماز نہیں ہو سکتی۔ میں نے یہ کچھ کہا کہ یہ اہلِ قرآن جو فتنہ اٹھا رہے ہیں' یہ امت کے اندر سخت فتنہ ہے۔ یہ تین وقتی نماز اور دو رکعتیں اور ایک سجدہ بالکل غلط ہے۔ امت جیسے کرتی چلی آ رہی ہے' بالکل اسی طرح سے کرتی چلی جائے تاوقتیکہ امت میں پھر سے خلافت علی منہاجِ رسالت کا سلسلہ نہ شروع ہو جائے۔ میں نے کہا کہ میں خود اسی طرح سے اسی پہ عمل پیرا ہوں' اسی طریق سے نماز پڑھتا ہوں' اسی طریق پہ روزے رکھتا ہوں۔

میرے خلاف جھوٹا پروپیگنڈا

آپ کو معلوم ہے کہ تین برس سے میرے خلاف پروپیگنڈہ ہو رہا ہے۔ میرے متعلق کیا ہو رہا ہے؟ یہ کہا جا رہا ہے صاحب! کہ یہ شخص کہتا ہے کہ تین نمازیں اور نو دن کے روزے اور ایک سجدہ اور اردو میں نماز ہے۔ یہ میرے متعلق کہا جا رہا ہے۔ ذرا سوچیے: یہ کون کہہ رہا ہے؟ اقامتِ دین کی سب سے بڑی جماعت' جماعتِ اسلامی' اس نے یہ کچھ سارے ملک کے اندر پھیلایا ہوا ہے۔ ان کے پاس پروپیگنڈے کی مشینری اتنی بڑی ہے کہ ہر مسجد ان کے قبضے میں ہے' پریس ان کے اپنے ہیں' اپنے ہزاروں آدمی یہ کچھ کہنے والے کہے چلے جا رہے ہیں۔ بیس برس سے ان چیزوں پر سینکڑوں ہزاروں صفحات لکھ چکا ہوں کہ میں ان کی مخالفت کر رہا ہوں۔ اپنے ہاں کہا

یہ گیا ہے کہ طلوعِ اسلام کو اگر کسی نے ہاتھ لگا دیا تو ایمان جاتا رہے گا۔ وہ اس لیے کہ یہ چیزیں اس میں موجود ہیں۔ ''اس کے قریب نہ جاؤ' اس کے درس میں نہ جاؤ' جادوگر ہے''۔ یہ جادوگر نہیں ہے۔ بات سچی کرتا ہے۔ مگر ان کا پروپیگنڈہ ہے کہ چل رہا ہے۔ اور وہ امت چل رہی ہے' ان کے پیچھے لگ رہی ہے' آپ لوگوں نے بھی تین نمازوں کا میرے متعلق سنا ہوگا۔ آپ کسی جگہ دیہات کے کسی ملاں کی مسجد میں چلے جایئے۔ وہاں بھی دیکھیے' لوگ کہیں گے صاحب! ایک فتنہ پرویزی اٹھا ہے' یہ نیا فرقہ ہے۔ بھئی! کیا کہتا ہے؟ تین نمازیں ہیں' دو دو رکعتیں ہیں' ایک سجدہ ہے' نو دن کے روزے ہیں' اردو میں نماز پڑھنی چاہیے اور فرقہ پرویزی۔ صد حیف! دیکھے نہ تری آنکھ نے فطرت کے اشارات۔' تم نے مجھے نماز پڑھتے بھی دیکھا ہوگا۔ کہیں اتفاق ہوا ہو' میری فوٹو کھینچے اور یہ چیزیں جو ہزاروں صفحات پہ لکھی ہوئی ہیں' کوئی شخص نہیں جو اٹھ کے انہیں سامنے سے یہ کہہ دے کہ ہم نے تو یہ دیکھا ہے۔ قوم کو یہاں پہنچا دیا گیا ہے۔ جاننے والے کہتے ہیں: جی کون ان کے ساتھ سر مارے' بھڑوں کے چھتے میں کون اینٹ مارے۔ ٹھیک ہے جی' غریب کی جورو سب کی بھابھی۔ وہ پرویز! اور یہ اس کی کتاب! جس کے متعلق جو جی میں آئے کہتے چلے جاؤ۔ تم جانتے ہوئے یہ کہتے ہو کہ ''صاحب! کون ان کے ساتھ چھیڑ خانی کرے''۔ ان کی کیفیت یہ ہے۔ وہ اپنے ایک مقصد کے لیے یہ سب کچھ کہتے ہیں۔ انہیں پتہ ہے کہ اس ملک میں ان کے کذب وافتراء کو' ان کی تمام حکمتِ عملی کو' ان کے رنگ کو' توڑنے والا صرف طلوعِ اسلام ہے۔ عزیزانِ من! کوئی دوسرا ان کے خلاف آواز نہیں اٹھاتا۔ انہوں نے ایسے ایسے سب کو ہائی جیک (Hijack) کر دیا ہے اور یہ سب کچھ اُس مقصد کے لیے کیا جاتا ہے کہ ان کے کذب وافتراء کا بھید نہ کھلے' اس لیے اس کو اتنا فتنہ پرداز بنا دو کہ جونہی کسی نے کہا: پرویزی فرقہ ہے' ہر طرف سے یہ صدا گونجے کہ جی تین نمازیں' نو دن کے روزے' دو رکعتیں' ایک سجدہ۔ اور یہ پروپیگنڈہ بدستور' مسلسل' چلا ہوا ہے۔ نہ کوئی اس سے آ کے پوچھتا ہے' نہ کوئی چٹھی Letter ہی لکھتا ہے۔ کوئی خط ہی لکھ کے پوچھ لے کہ تم ایسا کہتے ہو۔ کچھ نہیں۔ بس وہ تو ایک ہی لکھا ہوا ہے کہ اسے ہاتھ نہ لگاؤ' ہاتھ لگانے والے کا ایمان خراب ہو جاتا ہے۔ دیکھتے ہیں آپ کہ دنیا میں مذہب کی آڑ میں کیا ہوتا ہے۔ آپ کے سامنے یہ ہو رہا ہے' عزیزانِ من! اور شہادت تو ایک طرف رہی' ہزاروں کی تعداد میں' پمفلٹ چھاپ کے میں نے شائع کر دیا ہوا ہے' اس کے باوجود وہ پروپیگنڈہ جاری ہے۔ تو میں کہہ رہا تھا کہ یہ ہمارے دور میں قرآن کے نام کے ایک ایسی چیز اٹھی ہے۔ یہ ایک ایسا فتنہ اٹھا ہے کہ کم از کم قرآن تو اس الزام سے بچا ہوا تھا کہ اس میں اختلافی بات نہیں ہے۔ انہوں نے اس کو بھی ختم کر کے رکھ دیا۔

اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوْکِ الشَّمْسِ اِلٰی غَسَقِ الَّیْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ کَانَ مَشْھُوْدًا (17:78)۔ تمہارا پروگرام یہ ہونا چاہیے کہ علی الصبح ''طلوعِ آفتاب'' سے پہلے' قرآنی حقائق پر غور وفکر کرو اور دیکھو کہ معاملاتِ پیشِ نظر کے متعلق وہاں سے کیا راہنمائی ملتی ہے۔ علی الصبح اس لیے کہ فجر کے سکوت افزا سے میں' انسان کے خیالات میں' اس قدر یکسوئی ہوتی ہے کہ اس سے قرآنی حقائق' محدود مشہود شکل میں سامنے آ سکتے ہیں اور ''دل ان کی صداقت کی بے اختیار گواہی دے دیتا ہے۔ یہ

پروگرام دیا۔ عظیم پروگرام دیا ہے: صبح کے وقت قرآن کو سامنے رکھو' مشاورت سے دیکھو کہ اس پروگرام کے لیے دن بھر میں کیا کرنا ہے۔

تلاوت کا مفہوم قرآن کی پیروی کرنا ہے

عزیزانِ من! ہم بھی تلاوتِ قرآن' انفرادی طور پہ سہی' کرتے تو ہیں۔ ہم میں ابھی یہ روش باقی ہے۔ ہمارے ہاں کم از کم بڑے بوڑھوں اور بڑی بوڑھیوں میں تو ابھی تک گھروں کے اندر یہ روش ہے۔ غنیمت ہے کہ یہ صبح کے وقت اٹھ کے قرآن کھول بیٹھتے ہیں' اگرچہ وہ جو اس کا مقصد تھا وہ نہیں رہا۔ اگر وہ مقصد والی چیز ہو جائے تو دنیا کا نقشہ بدل جائے۔ تلاوت کے معنی پڑھنا نہیں ہیں' تلاوت کے معنی ''پیروی کرنا ہیں''۔ صبح کے وقت کی یہ روش ہمارے ہاں ابھی تک جاری ہے' یہ بڑی حسین روش ہے۔ عزیزانِ من! اگر آپ صبح کے وقت اٹھ کے دیکھ لیں کہ قرآن آج میرے لیے کیا پروگرام دیتا ہے اور پھر دن اس سے شروع کریں بسم اللہ پڑھ کے دیکھیے اس کے اندر کتنی برکت ہوتی ہے۔ اور اگر اجتماعی طور پہ آپ کے ہاں یہ چیز ہو جائے کہ کوئی عملی پروگرام' جو آپ نے طے کرنا ہے' اس کے لیے نظری طور پہ بیٹھ کے پہلے سوچیں کہ قرآن کیا کہتا ہے اور یہ سوچنے کے بعد پھر دِن اس سے شروع کریں۔ دلوک الشمس سے غسق الیل تک اس پروگرام پر عمل پیرا رہیں۔ آپ گھروں کو چلے جائیں لیکن سربراہ کی کیفیت وہی ہو جو ہمارے نبی کریم کو کہا تھا کہ وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ (17:79)۔ اگر حالات کا تقاضا ہو تو تم اس مقصد کے لیے رات کے کچھ حصے میں بھی جاگتے رہو اور معاملات پر مزید غور و فکر کرو۔ مگر یاد رہے کہ یہ خصوصیت نَافِلَةً لَّكَ یہ صرف تیرے لیے ہے کہ بیٹھ کے سوچے کہ اب کیا کرنا ہے۔

اس پروگرام پر عمل کرنے کا نتیجہ مقامِ محمود ہوگا

یہ سارا کچھ کرنے کے بعد' عزیزانِ من! کیا کہا؟ اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ سنیے عزیزانِ من! نتیجہ کیا ہوگا؟ عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا (17:79)۔ تُو دیکھے گا کہ اس پروگرام پہ عمل کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تجھے مقامِ محمود حاصل ہو جائے گا۔ محمود کے معنی یہ ہیں کہ ''جب تُو اس نظام کو قائم کرے گا تو ساری دنیا تیری شان میں ستائش اور حمد کے کلمے پڑھنے کے لیے مجبور ہو جائے گی۔ کہے گی کہ اس شخص کی کیا بات ہے' کیا عالمگیر نظام دے گیا ہے''۔ تُو نے تو مقامِ محمود پر کھڑا ہونا ہے' برادرانِ عزیز! آپ نے کبھی ان الفاظ پر غور نہیں کیا' ہم کیا غور کریں گے! نعتوں کے اندر محبوب کی زلفوں اور خد و خال کا ذکر جو آ جاتا ہے۔

حمد کا مفہوم

عزیزانِ من! ایک لفظ سے کتاب اللہ شروع ہوئی' خدا کا کلام شروع ہوا' وہ لفظ ہے: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ (1:1)۔ ایک لفظ ہے حمد اور ''ال'' اس کے اوپر ہے۔ عربی زبان جاننے والے جانتے ہیں کہ عام حیثیت سے جو حمد ہے' یہ خدا کے لیے ہے۔ یہ کتنی بڑی چیز تھی! اور حمد آپ کو معلوم ہے کہ اس کا ترجمہ تعریف نہیں ہے' Praise نہیں ہے۔ اسکا یہ ترجمہ بالکل ناکافی ہے۔ حمد تو ہوتا ہے کسی تحسین و

Marfat.com

ستائش (Appreciation) کے دلی جذبات کا اظہار' جو مصور کے' کسی تخلیق کرنے والے کے' نادر شاہکار کے لیے ہو' جو نوعِ انسانی کی منفعت کے لیے کیا گیا ہو۔ عربوں کی لغت کے اندر یہ سب شرطیں حمد کی ہیں۔ عزیزانِ من! یہ بلا کی قوم تھی۔ تخلیق کرنے والے کا نادر شاہکار' جو منفعتِ عامہ کے لیے وجود میں لایا گیا ہو' اس طرح مکمل یافتہ ہو کہ جو دیکھے' بے ساختہ کہہ اُٹھے کہ آہا! اس شاہکار کا خالق کتنا عظیم اور برتر ہے۔ اس کو حمد کہتے ہیں۔ اس حمد کی کیا بات ہے! یہ تھی حمد' خدا کے لیے۔ اور محمود کہتے ہیں جس کی حمد کی جائے۔ یہاں رسول اللہؐ کے متعلق یہ کہہ رہے ہیں' اس نظام کے متعلق کہہ رہے ہیں' اس جماعت کے متعلق کہہ رہے ہیں' کہ تمہیں مقامِ محمود حاصل ہونا ہے۔ وہ الحمد جو خدا کے لیے ہم نے وہاں مخصوص کی تھی' اس حمد کا پرتو اس کے اندر نظر آئے گا۔

عزیزانِ من! اب حمد خدا کے لیے ہے۔ مقامِ محمود یہاں حاصل ہو رہا ہے۔ اور حضورؐ کے تو اسمِ گرامی یا محمد ہیں یا احمد ہیں۔ مقامِ محمود ہے صاحب! وہ حمد ہی حمد ہے۔ جو دیکھے بے ساختہ پکار اٹھے۔ اب بھی عزیزانِ من! حضورؐ کی وہ سوانح حیات جو مستشرقین کی لکھی ہوئی ہیں' آج بھی موجود ہیں۔ وہ مخالفت بھی کرتے ہیں لیکن یہ کہنے کے لیے مجبور ہو جاتے ہیں کہ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ نوعِ انسانی کی منفعت کے لیے جو نظام یہ شخص پیدا کر گیا ہے' اس سے بہتر نظام نہیں ہو سکتا۔ حضور ﷺ کو محمود کہنے کے لیے مجبور ہیں۔ عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا (17:79)۔ تُو یہ کر اور پھر دیکھ کہ کس طرح سے تجھے مقامِ محمود حاصل نہیں ہوتا؟ اور جسے مقامِ محمود حاصل ہوتا ہے اس کے لیے دنیا بے ساختہ پکار اُٹھی ہے کہ خدا کے نظامِ ربوبیت کی طرف دعوت دینے والے کا مقام فی الواقعہ ایسا ہی قابلِ حمد و ستائش ہونا چاہیے۔

مملکت اسلامیہ کا سربراہ صفاتِ محمود کا حامل ہونا چاہیے

عزیزانِ من! جو محمود ہوتا ہے' اسی کو آپ کے اسلامی نظام کے برسرِ اقتدار رہنے کا حق ہے۔ جہاں کوئی چیز بھی کسی سے جبراً نہ کرائی جائے' وہاں ہر شخص کی زبان پہ اس کے لیے تعریف ہی ہوتی ہے۔ اگر اس کے برعکس ہو' کسی سے مجبوراً تعریف کرائی جائے تو اس کو مجبور ہو کے کرگذرتا ہے' اس کو مان بھی لیتا ہے۔ تھانے والے جو روز کہتے ہیں کہ صبح آ کے حاضری دیا کرو' تو وہ حاضری تو دے آتا ہے۔ کیا اس کے بعد گھر آ کے وہ اس کی شان میں قصیدہ بھی پڑھتا ہے؟ قطعاً نہیں۔ یہ صرف اس قسم کی اطاعت ہے۔ یہ وہ شے نہیں ہے' جس سے تعریف و ستائش دل کی گہرائیوں سے نکلے۔ وہ تو اس قسم کا ایک نظام قائم کرنا ہے کہ جس میں ہر شخص بے ساختہ اس کی تعریف کرنے پہ مجبور ہو جائے کہ کیا بات ہے! یہ تھا وہ نظام جو حضورؐ نے قائم کیا اور یہ تھا مقامِ محمود جو اس نظام کے قائم کرنے والے کو حاصل ہوتا ہے اور یوں حضور ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے رحمت للعالمین کہا ہے۔

Marfat.com

رحمت کا مفہوم

رحمت کے معنی ہیں ''نہایت نرمی سے' سامانِ نشوونما بہم پہنچانا''۔ نہایت نرمی سے سامانِ نشوونما پہنچانے کی شرط ہے۔ یہ جیل خانے کے داروغے کی طرح روٹی دینا نہیں۔ یہ اس طرح کا سامانِ نشوونما پہنچانا ہے' جس طرح ماں اپنے بچے کی پرورش رحم (Womb) کے اندر کرتی ہے۔ رحمت تو رحم سے ہے اور اس پرورش کی بنیاد یہ ہوتی ہے۔ ماں کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے اور اس کوشش کا Process یہ ہے کہ وہ اپنا آپ انڈیل کے بچے کے اندر داخل کرتی چلی جاتی ہے تو جس سے یہ پرورش پاتا چلا جاتا ہے' خواہ آپ کمزور ہوتی چلی جائے۔ ''اودیاں خیراں روز منگدی ہیگی اے' چن میرا وڈا ہویگا' سوھنا ہویگا' بھاگ لگن گے' سہرے لگن گے' دلہن آئیگی۔''[1] یعنی اس کے مستقبل کے متعلق' یہ سب کچھ کرے گی۔ وہ جو کچھ کھائے گی' وہ صرف اس لیے ہوگا کہ اس سے زیادہ سے زیادہ دودھ بنے' اس کے اندر وہ انڈیل دے تاکہ اس کی پرورش ہو۔ یہ جو طریق ہے' اسے رحمت کہتے ہیں۔ یہ رحم (Womb) سے ہے۔ اسی لیے حضور ﷺ کو رحمت کہا ہے۔ وہ جو عیسائیت کا ''صابر'' کا تصور تھا' وہ تصور قرآن نے نہیں دیا۔ عیسائیت کے اس تصور کی رو سے پرورش اور انداز کی ہوتی ہے' اس کے برعکس ماں جو پرورش کرتی ہے وہ اور انداز کی ہوتی ہے۔ جس محبت سے یہ گلے سے چپکا کے بچے کو دودھ پلاتی ہے' باپ میں یہ بات نہیں ہوتی۔ اپنے بدن کا جزو دوسرے کو دیتے چلے جانا' اور محبت سے دیتے چلے جانا' شفقت سے دیتے چلے جانا' یہ ہے وہ چیز جس سے مقامِ محمود حاصل ہوتا ہے۔

خدا کی حمد اسی لیے ہے کہ وہ رب العٰلمین ہے

یہاں بھی اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ (1:1) کے بعد رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (1:1) کہا ہے اور وہ اس لیے برسرِ حمد وستائش ہے کہ ربوبیتِ عالمینی کرتا ہے' ورنہ جو ربوبیت عالمینی نہیں کرتا' وہ حمد وستائش کا مستحق ہی نہیں ہوتا۔ اور یہاں مقامِ محمود حاصل ہو رہا ہے۔ عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا (17:79). قرآن کا کیا ہی عجیب پروگرام ہے! کیا کڑیاں سونے کی مالا کی طرح ایک دوسرے کے ساتھ پروئی ہوئی چلی آ رہی ہیں! دیکھا کہ یہ پروگرام میں مفاہمت ومصالحت چاہتے ہیں۔ حق پر رہنے والا مصالحت نہیں کرتا۔ ''جواب دیدو ان کو۔'' جواب دیا ہے' تو اب ٹکراؤ ہوگا' بڑی شدت کا ٹکراؤ ہوگا۔ ٹکراؤ کے لیے کیا صورت ہوگی۔ پروگرام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے صبح سے شام تک سرگرمِ عمل رہنا ہے اور اس کے بعد راتوں کی تنہائیوں میں جاگ کے تمہیں پھر غور کرنا ہوگا۔ یہ سارا پروگرام تم کرو گے تو اس کے بعد تم دیکھو گے کہ مقامِ محمود حاصل ہو جائے گا۔ یہ ٹھیک ہے کہ کبھی اس میں set back ہوتا ہے' کبھی انسان آگے بھی بڑھتا ہے' کبھی پیچھے بھی ہٹنا پڑتا ہے۔ یہ ساری چیزیں Strategy چاہتی ہیں۔ اِس کے لیے کہا کہ کوئی بھی صورت ہو' تمہیں صبح سے شام تک اور رات کی تنہائیوں میں بھی اس پروگرام کے لیے سرگرم عمل رہنا ہے۔

---

[1] روزانہ اس کی بھلائی چاہتی ہے: میرا چاند بڑا ہوگا' بلا کا خوبصورت ہوگا' اس کے بخت ثمر دبار لائیں گے' سہرے سجیں گے' دلہن آئیگی۔

Marfat.com

دعا میں ہمیشہ خیر کا پہلو مضمر ہو' حق وصداقت کا پہلو ہو

سنیے اگلی کڑی' عزیزانِ من ! وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْکَ سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا (17:80)۔ آرزو یہ کرو' دعا یہ مانگو کہ یااللہ! اگر میں کہیں آگے بڑھوں' تو پھر بھی حق وصداقت کا پرچم ہاتھ میں لیے ہوئے آگے بڑھوں۔ یہ نہ ہو کہ غلبہ حاصل ہو رہا ہے تو اس وقت پھر میں عدل کو' انصاف کو' صداقت کو' چھوڑ دوں۔ صدق کے ساتھ آگے بڑھنا ہے اور اگر کہیں پیچھے ہٹنے کی ضرورت پیش آئے تو پھر بھی حق وصداقت کو ہی لے کے ہو۔ وہاں تمہارے اوپر کہیں مایوسی اور قنوطیت نہ چھا جائے۔ وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْکَ سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا (17:80)۔ مجھے غلبے کی ضرورت ہے۔ قوت کی ضرورت ہے۔ مجھے مدد کی ضرورت ہے۔ مجھے باطل کی طرف نہیں جھکنا' نہ کہیں اور سے مدد لینی ہے۔ مجھے مدد دینی ہے تو تُو نے دینی ہے' مجھے تُو نے غلبہ عطا کرنا ہے۔ اے اللہ! مجھے تُو اپنی طرف سے غلبہ عطا کر' مجھے اس مقصد کے لیے ان کا محتاج نہ بنا دینا۔ ہم تو اس پروگرام میں کسی ایسے شخص کی مدد بھی نہیں لے سکتے عزیزانِ من! جو اس پروگرام کے ساتھ متفق نہ ہو' ہم تو ان کے ساتھ اتحاد نہیں کر سکتے اور کہا کہ تم یہ کچھ کرو' انہی Do`s اور Dont`s کے مطابق سرگرم عمل رہو۔

اعلان ہو تو یہ ہو کہ حق آ گیا' باطل چلا گیا

اس کے بعد اعلان کر دو۔ کیا اعلان ہے؟ کہو کہ وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ (17:81)۔ ان کے سامنے اعلان کر دو: ''وہ آ گیا حق' وہ گیا باطل''۔ اعلان کر دو کہ حق آ گیا' باطل چلا گیا۔ بھئی! یہ باطل چلا گیا' کیا خود ہی چلا گیا؟ کہا: نہیں صاحب! اِنَّ الْبَاطِلَ کَانَ زَهُوْقًا (17:81)۔ باطل تو اس وقت تک رہتا ہے' جب تک حق نہیں آتا۔ تاریکی اس وقت تک ہوتی ہے' جب تک روشنی نہیں آتی۔ کتنا ہی تاریک ترین کمرہ کیوں نہ ہو' بجلی بجھ جاتی ہے تو اس کے بعد دیکھتے ہیں کہ کتنی تاریکی چھا جاتی ہے! بالکل تاریکی ہی تاریکی۔ اس میں ایک دیا سلائی جلا لیجیے' اسی میں آپ دیکھتے ہیں کہ باطل کی تاریکی گئی۔ موم بتی جلا دیجیے اس میں بھی یہ چیز ہو جاتی ہے۔ اندھیرا نہیں ہوتا' روشنی کم سہی۔ جونہی سورج کی پہلی شعاع نکلی' تاریکی گئی۔

رات کے ماتھے کی سیاہی کے نشان' صرف خورشید درخشاں کے نکلنے تک ہیں

وہ اپنی اپنی گدڑی لپیٹ کے' وہ بھاگیں رات کی ساری تاریکیاں! رات کی ساری تاریکیاں! کہا: اِنَّ الْبَاطِلَ کَانَ زَهُوْقًا (17:81)۔ باطل کا جو شر ہے اس کا کہیں وجود نہیں ہے۔ تو دراصل یہ حق کا عدم ہے' جو باطل ہے۔ حق کا نہ ہونا ہے' جو باطل ہے۔ یہ بات نہیں کہ یہ دوہرا پروگرام ہوتا ہے کہ پہلے حق کو لاؤ' یہاں اس کو بسا کے' ہاتھ میں ڈنڈا لے کے بیٹھو' پھر تت تت کر کے باطل کو نکالو۔ ایسا قطعاً نہیں ہے۔ یہ ایک ہی پروگرام ہے۔ بس تم حق کو لے آؤ۔ حق کے آنے کی' جب صورت ہو جائے تو اسکے وجود کا فطری

Marfat.com

نتیجہ یہ ہے کہ باطل نہیں رہے گا۔ باطل کے ساتھ مفاہمت کر کے کسی طرح سے بھی آپ باطل کو نہیں نکال سکو گے' اس سے تو تم نے صلح کر رکھی ہے کہ ٹھیک ہے تم بھی رہو' ہم بھی رہیں گے:

تم جانو' تم کو غیر سے جو رسم وراہ ہو
مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

(غالب)

لیکن یہ نہیں ہوسکتا۔ حق آئے گا' باطل باقی نہیں رہے گا۔ یہ ہے وہ پروگرام' عزیزانِ من! جو دیا گیا ہے اور اس پروگرام کی اصل' اساس اور بنیاد کیا ہے؟ کہا: وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا (17:82)۔ قرآن نے اسے بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے۔ لیکن آج وقت ہو گیا ہے' بات ذرا لمبی چلی جائے گی: شفاء ہے' مومنین کے لیے رحمت ہے۔ اس کے اندر ظالمین کے لیے بڑی تباہی ہے۔ یہ ہم آئندہ درس میں لیں گے۔ سورۃ بنی اسرائیل کی آیت 81 تک ہم آ گئے۔ 82 سے آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ.

❁❁❁❁

پندرھواں باب: سورۃ بنی اسرائیل (آیات 82 تا 93)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا ﴿٨٢﴾ وَاِذَآ
اَنْعَمْنَا عَلَى الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَنَاٰ بِجَانِبِهٖ ۚ وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ كَانَ يَـُٔوْسًا ﴿٨٣﴾ قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ ۭ
فَرَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ اَهْدٰى سَبِيْلًا ﴿٨٤﴾ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ۭ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ
مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿٨٥﴾ وَلَىِٕنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهٖ عَلَيْنَا وَكِيْلًا ﴿٨٦﴾
اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ۭ اِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ عَلَيْكَ كَبِيْرًا ﴿٨٧﴾ قُلْ لَّىِٕنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا
بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ﴿٨٨﴾ وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا
الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ۚ فَاَبٰٓى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا ﴿٨٩﴾ وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ
الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا ﴿٩٠﴾ اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا ﴿٩١﴾ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ
كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰۗىِٕكَةِ قَبِيْلًا ﴿٩٢﴾ اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي
السَّمَآءِ ۭ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ ۭ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا
رَّسُوْلًا ﴿٩٣﴾

عزیزانِ من! آج ستمبر 1975 کی 14 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورہ بنی اسرائیل کی آیت 82 سے ہو رہا ہے۔ 17:82۔ آپ کو یاد ہوگا کہ سلسلہ کلام یوں چلا آ رہا تھا کہ آپ ﷺ یعنی نبی اکرمؐ جو دعوت اور نظام پیش کر رہے ہیں' اس میں یہ لوگ اب اس سٹیج پہ آ گئے ہیں کہ انہوں نے تمہاری قوت کو محسوس کرنا شروع کر دیا ہے۔ یہ کہیں گے کہ آپ کے ساتھ کچھ Compromise کر لیا جائے' کچھ مفاہمت کی جائے' کچھ مصالحت کی جائے' کچھ یہ بڑھیں' کچھ تم پیچھے ہٹو۔ کہا کہ حق تو کسی کے ساتھ مفاہمت کر ہی نہیں سکتا۔ حق جب اپنے مقام پہ اٹل ہوتا ہے تو حق ہوتا ہے اور اگر ذرا بھی اپنے مقام کو چھوڑ دے تو باطل ہو جاتا ہے۔ اس لیے اس مصالحت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کہا کہ پھر اس کے بعد ان کی اگلی صورت یہ ہوگی کہ یہ جب مایوس ہو جائیں گے کہ مفاہمت بھی نہیں ہو سکتی تو اسکے بعد یہ ایک آخری ہلہ بولیں گے کہ تمہیں اس ملک سے ہی باہر نکال دیا جائے تو یوں یہ فتنہ ختم ہو۔

Marfat.com

دوسروں کے لیے مذہب تو قابلِ برداشت ہوتا ہے' دین نہیں ہوتا

یہ چیز آپ کے سامنے آ گئی ہوگی کہ یہ بات صرف مذہب کی نہیں تھی۔ مذہب کو تو سب برداشت کر لیتے ہیں۔ بات دین کی تھی' بات ایک نظام کی تھی۔ ایسا نظامِ زندگی متمکن کرنا چاہتے تھے' جسے الاسلام کہا جاتا ہے' جس سے ان مفاد پرستوں کی تمام مفاد پرستیاں ختم ہو جاتی تھیں اور یہ تھی ان کی وجہ مخاصمت' ورنہ اپنے تصور کے مطابق صلوٰۃ کی اجازت تو حضرتِ شعیبؑ کو ان کی قوم نے بھی دیدی تھی لیکن اس کے بعد جب انہوں نے کہا تھا کہ شعیب ہم تو کچھ صلوٰۃ کو نماز ہی سمجھے ہوئے تھے۔ یہ تو بات ہی کچھ اور نکلی۔ تم کہتے ہو کہ ہم اپنا مال بھی اپنی مرضی سے صرف نہیں کر سکتے تو یہ تو ایسی بات نہیں کہ جس کی ہم تمہیں اجازت دیں۔ ہم تمہیں اپنے گاؤں سے نکال دیں گے۔ قرآن نے کہا ہے۔ سُنَّةَ مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا (17:77)۔ کہ یہ کوئی نرالی بات یا انوکھی بات نہیں ہے۔ یہ تو شروع سے ہی ایسا ہوتا چلا آ رہا ہے۔ مخالفت کی قوتیں یہی کچھ کرتی چلی آ رہی ہیں۔ یہی تمہارے ساتھ ہو رہا ہے۔ اب ان کا اگلا حربہ یہ ہوگا کہ اسے یہاں سے نکال دیا جائے اور پھر اس کی مدافعت کے لیے آپ کو میدانِ جنگ میں بھی آنا پڑے گا اور اب وہ بڑا سخت مرحلہ شروع ہو گیا۔ اس مرحلے کی تیاری کے لیے کہا کہ بھئی! اب تو صبح سے شام تک اس پروگرام کے لئے تمہیں منہمک اور سرگرداں رہنا ہوگا اور رات کو تمہارے یہ ساتھی' جو اس پروگرام سے تھک تھکا کے گھر بھی چلے جائیں تو تم تو سربراہ ہو' تمہاری ذمہ داریاں تو ان سے بڑی زیادہ ہیں' تم نے توکل کا پروگرام بھی چاک آؤٹ کرنا ہے۔ اس لیے وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ (17:79)۔ تمہیں رات بھی جاگنا پڑے گا اور یوں یہ پروگرام ایسا آئے گا کہ جس میں پھر وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ (17:81)۔ کہ وہ حق آ جائے گا۔ اعلان کر دو' تم پہلے ہی اعلان کر دو کہ حق آ گیا اور باطل چلا گیا۔ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا (17:81)۔ باطل ٹھہر نہیں سکتا۔ یہ تو اس وقت تک ٹھہرتا ہے جب تک حق نہیں آتا۔ اندھیرے کا اپنا وجود نہیں ہوتا۔ روشنی کے نہ ہونے کا نام اندھیرا ہے۔ لہٰذا عزیزانِ من! یہاں سے تو یہ بھی نظر آ گیا کہ یہ جو ہم رونا روتے رہتے ہیں: جی! غلط رسوم' غلط معاشرہ' غلط اخلاق' غلط سیاست' غلط معیشت' یہ سب غلط' یہ سب باطل ہے تو یہ باطل اس لیے ہے کہ ہم حق کو لا نہیں رہے تو باطل کے ہاتھوں روتے رہنے سے باطل نہیں جائے گا۔ پہلی شرط جَآءَ الْحَقُّ (17:81) کی ہے تو وہ تو حق کے لانے سے یہ باطل نیست و نابود ہوگا۔

شمعیں روشن کیجیے' اندھیرا فوراً کافور ہو جائے گا

اندھیرے میں بیٹھے ہوئے روتے رہیے' اندھیرا چلا نہیں جائے گا۔ آپ کو دیا سلائی جلانی پڑے گی' موم بتی جلانی پڑے گی' شمعیں روشن کرنا پڑیں گی' قمقموں کی تابندگی بڑھانی پڑے گی۔ یہ کیجیے' اندھیرا چلا جائے گا' مگر یاد رکھیے' یہ از خود نہیں جائے گا۔ رونے سے نہیں جائے گا' اسے کافور کرنے کے لیے آپ کو حق کو لانا ہوگا۔ یہ ہے آپ کے لیے مثبت قدم' جو آپ کو اٹھانا ہوگا۔

Marfat.com

فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً (17:79)۔ میں نے کہا تھا کہ قرآن کا ایک ایک لفظ دیکھیے' اس پہ غور کیجیے۔ کہا: اس قرآن کے ساتھ تمہیں رات کو جاگنا پڑے گا۔ اب راتوں کی تنہائیوں میں اسے Consult کرو' مشورہ کرو اور پھر دیکھو کہ اب آئندہ وہ تمہیں کیا پروگرام دیتا ہے۔ تمہیں جو مسائل درپیش ہیں' تمہیں ان کا حل ملے گا۔ ہم نے کہہ رکھا ہے کہ ہمیں پکارو' ہم جواب دیں گے۔ تم پکارو تو قرآن صحیح جواب دے گا' تمہاری ہر مشکل کا حل بتائے گا۔ اس کے بعد کہا ہے کہ تم دیکھو: وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ (17:82)۔ یہ سب کچھ قرآن کی رو سے ہوگا تو بات صاف ہوگئی کہ فَتَهَجَّدْ بِهٖ جو ہے' وہ تو یہ قرآن ہے' جس کے لیے یہ سارا کچھ کہا جا رہا ہے کہ اس کو Consult کرو اور اس پہ غور و فکر کرو۔ دیکھو! یہ کیا کہتا ہے۔ ہم نے قرآن کو نازل ہی اس لیے کیا ہے۔

مریض کا پہلا سوال

اب یہ دیکھیے عزیزانِ من! اس کے اندر دو چیزیں آ گئیں۔ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ (17:82)۔ یہاں دو خصوصیاتِ کبریٰ بتائی گئیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ خصوصیات اتنی جامع ہیں کہ اس کے بعد کچھ اور کہنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ مریض کے لیے پہلا سوال یہ ہوتا ہے کہ کیا مرض سے شفا حاصل ہو جائے گی؟ کیا مرض جاتا رہے گا؟ پہلی چیز یہ ہے کہ مرض جاتا رہے لیکن صرف مرض کے چلے جانے سے تو وہ اپنی اصلی حالت میں نہیں آ سکتا۔ اس دوران مرض نے جو اس کی توانائیاں کم کر دی ہیں' کمزوریاں پیدا کر دی ہیں' ان کا رفع کرنا بھی تو اس کے بعد ضروری ہوگا۔ آپ دیکھیے کہ آپ جتنے بھی علاج کراتے ہیں' ان میں ایک چیز تو اس مرض کے ازالے کے لیے ڈاکٹر دیتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ کہتا ہے کہ بھئی! اب اس کے بعد ہمیں کچھ Tonics بھی دینے چاہئیں تاکہ وہ کھوئی ہوئی توانائیاں' جو مرض نے سلب کر لی تھیں' وہ بھی تو واپس آئیں۔ وہ جو اتنے دنوں ان امراض کی وجہ سے تمہاری زندگی کے ہر شعبے کی صلاحیتوں کی نشوونما رک گئی تھی' وہ دور ہو۔ انحطاط تو کہتے ہی اسے ہیں' زوال تو ہوتا ہی یہی ہے کہ اس میں کمی آ جاتی ہے۔ ان امراض کی وجہ سے جو کمی آ گئی ہے' ان کے دور کیے جانے کی بھی ضرورت ہے۔ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ (17:82)۔ یہ جتنے روگ ہیں سنیے! یہ ان کو دور کرے گا اور ان بیماریوں نے جو کمزوریاں' جو نقاہتیں' جو زوال و انحطاط و ہبوط پیدا کر دیا تھا' یہ ان کے لیے ٹانک بھی ہوگا۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں نے بتایا تھا کہ رحمت اس طرح کی نشوونما ہے' جس میں لوچ ہو' لچک ہو' تقاضے کے مطابق ہو۔ یہ بالکل اسی طرح کی ہے۔ جیسے رحمِ مادر میں بچے کو نشوونما ملتی ہے۔

رحمِ مادر میں بچے کو کبھی بدہضمی نہیں ہوتی

اب غور کیجیے' قرآن میں کیا لفظ آیا ہے! بیماری رفع ہونے کے بعد مریض خود اتنا کمزور ہو گیا ہوتا ہے کہ اگر آپ اسے پہلے دن پلاؤ کھلا دیں تو وہ بدہضمی کا شکار ہو جاتا ہے۔ وہ جو بیماری سے دوسرے ہی دن اٹھ کے کھانا شروع ہوتا ہے' تو آپ کو پتہ ہے کہ اس سے

بہت سے مریض پھر مریض ہو جاتے ہیں۔اس لیے اسے جو دوبارہ توانائی دینی ہوگی' وہ رحمت کے طریق پہ دینی ہوگی۔رحمِ مادر میں بچے کو کبھی بدہضمی نہیں ہوتی۔وہ تو ہم جو ٹھونستے ہیں اس سے یہ بچہ کمزور ہوتا ہے۔یہ کیا ہے' جو کھوئی ہوئی توانائی کو پھر نہیں واپس لاتا؟ یا تو اس کو اس تقاضائے وقت کے مطابق ٹانک نہیں دیتے یا جو کچھ مریض کو ملتا ہے' وہ یوں ہی ختم ہو جاتا ہے' جزوِ بدن نہیں بنتا' دینے والے دیتے ہیں تو ان میں تناسب اور توازن نہیں ہوتا۔یہ جو ڈاکٹر دوائی کی خوراک Dozes مقرر کرتا ہے' یہ بڑی اہم چیز ہے۔اسے آپ اوزان کہتے ہیں۔رحمت میں یہ چیز ہوتی ہے کہ جس حالت میں کوئی ہے' اُسے اس حالت کے مطابق سامانِ نشوونما دینا' جس میں لچک اور لوچ کا پہلو رکھا جائے' اس کے اندر صلابت اور کرختگی نہ ہو۔ قرآن نے یہ دونوں چیزیں بتائیں۔تو پہلے شفآء کہہ دیا۔یہ تو حصہ ''لا'' ہو گیا۔یہ جتنے غلط اعتقادات' رسومات' یہ بندھن' اغلاط' سلاسل' یہ سارے جتنے بھی ہیں' ان سب کو پہلے رفع کرنا ہوگا۔شفاء نام ہی اس چیز کا ہے۔ پہلے تو ان تمام کو دور کرنا پڑے گا۔

مَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى (2:256)۔ پہلے طاغوت سے انکار کرنا پڑے گا' اس سے کفر برتنا پڑے گا۔پھر خدا پہ ایمان آ سکتا ہے۔اور ہم ہیں کہ یہ سارا کفر اور شرک برقرار رکھتے ہوئے اس کے ساتھ ساتھ نمازیں پڑھتے چلے جاتے ہیں اور روزے رکھے چلے جاتے ہیں۔ہم پہلے ''لا'' کا حصہ پورا ہی نہیں کرتے' جس کی وجہ سے ہمارے یہ اعمال نتیجہ خیز نہیں ہوتے۔لہٰذا ہمیں پہلے کفر کے حصے کو دُور کرنا ہوگا۔اسے تو دُور ہی نہیں کیا جاتا۔ پہلے ''لا الہ'' ہے' پھر ''الا اللہ'' آتا ہے۔ شفاء کا وہ پہلا حصہ ''لا'' کا ہے۔مرض کو دُور کرو۔بدہضمی (Indigestion) کے دوران دودھ پلائے جایئے' تو بدہضمی نہیں جائے گی۔آگے یہ آتا ہے کہ پھر وہ دودھ کیا کرے گا۔تو یہ پروگرام' یہ پروسیس Process بڑا ضروری ہے' عزیزانِ من! یہ جو پہلا حصہ ''لا'' ہے' اسے پہلے دُور کیا جائے تو یہ شفا ہو گئی۔یہ پہلی چیز ہے۔اس کے بعد پھر جو ''الا'' کا حصہ آئے گا کہ یہ کرو' اس سے کھوئی ہوئی توانائیاں آپ کو ملیں گی۔افراد میں بھی یہی کیفیت ہوتی ہے' اقوام میں بھی یہی کیفیت ہوتی ہے۔

سب سے پہلے غلط نظام کو بدلنا ہوگا

جب تک قومیں اپنے پہلے سے قائم شدہ باطل نظام کو' غلط نظام کو' نہیں بدلیں گی یعنی غلط نظام کی سلیٹ کو صاف نہیں کریں گی' اس سے انکار نہیں کریں گی' اس سے کفر نہیں برتیں گی' اس سلیٹ پہ کچھ اور لکھا ہی نہیں جا سکتا۔یہ ذہنوں کو اور سوچ کو' بدلے بغیر اسلام قطعاً نہیں آ سکتا۔حصۂ لا میں بڑی جرأتوں کی ضرورت ہے' عزیزانِ من! بڑی جرأتوں کی ضرورت ہے۔دوائی پلانا بہت مشکل ہے' اس کے بعد ٹانک پلانا تو آسان ہو جاتا ہے۔جو چیزیں متوارث چلی آ رہی ہیں' وہ پہلا حصہ ہیں۔مثلاً وہ جو بچھڑے کی محبت کا قرآن نے کہا ہے کہ ان گئوسالوں کے دل کی گہرائیوں میں پیوست ہو چکی ہوتی ہے۔یہ جو متواتر چیزیں آ رہی ہوتی ہیں' وہ جو قوموں کے اندر غلط چیزیں

Marfat.com

متوارث آ رہی ہوتی ہیں' وہ تو جزوِ زندگی بن جاتی ہیں' عین ایمان بن جاتی ہیں۔ان کا نکالنا بڑا مشکل ہے۔اس کے لیے بڑی ہی جرأت کی ضرورت ہے۔بس یہ ہے مرحلہ جو جرأت طلب ہے۔حقیقت میں ان کا مٹانا' ان سے الگ ہونا' بڑی جرأت طلب ہے اور یہی جو باطل کی قوتیں ہیں' ان کا سارا زور اس پہ ہوتا ہے کہ ان غلط چیزوں کو اس قدر اچھا' مقدس اور صحیح بنا کے پیش کیا جائے کہ یہ انہیں دل سے دور نہ کر سکیں۔کوئی ذرا سا دل میں خیال آئے کہ یہ تو کچھ غلط ہیں تو چاروں طرف سے' دھوم دھام سے' ان کے متعلق ان کی اتنی وعظیں' نصیحتیں اور ہدایتیں آتی ہیں کہ وہ انہیں پختہ سے پختہ تر کیے چلے جاتے ہیں۔

قرآن ان تمام بیماریوں کے لیے نسخہ کیمیا ہے

قرآن کا پروگرام تو یَكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ (2:28) ہے۔یہ نہایت ضروری ہے۔ایمان باللہ سے پہلے لاالہ ضروری ہے۔ الا اللہ تک پہنچنے سے پہلے "لا الہ" ضروری ہے۔قرآن شفآء ہے۔یہ بیماریاں کیسے دور ہوں؟ اس کے لیے قرآن ایک کسوٹی (Criterion) ہے۔سیدھی سی بات ہے کہ اس کو سامنے رکھ لے اور پرکھتا چلا جائے کہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں' کرتے چلے آ رہے ہیں' اس میں سے کیا کیا صحیح ہے اور کیا کیا غلط ہے؟ ڈاکٹر صاحب! کھاؤں کیا؟ کیا نہ کھاؤں؟ بھئی! اس وقت یہ بھی چھوڑ دو۔یہ بھی چھوڑ دو' یہ رہنے دو۔وہ شخص اس کا کیسے فیصلہ کر رہا ہے؟ اس کے پاس ایک قانون ہے کہ مرض یوں جائے گا۔قرآن شفآء دیتا ہے۔یہ بتائے گا کہ تمہارے امراض کیا کیا ہیں اور وہ کیسے رفع ہونگے۔یہی وہ جرأتیں پیدا کرے گا' عزیزانِ من! کوئی دوسری چیز یہ کچھ پیدا نہیں کر سکتی۔اور وہ یہی چیز ہے جس کے قریب یہ نہیں آنے دیتے۔یہ جتنے بھی غلط مناسک' مناہج اور مسالک کے مدعی و دعویدار و علمبردار ہیں' وہ یہی چیز نہیں ہونے دیتے۔الا اللہ کا اگلا حصہ تو بڑی دور جا کے آتا ہے۔یہ پہلا حصہ کفر بالطاغوت کا ہے' وہ قوموں کو اس پہ آنے نہیں دیتے۔اس لیے کہ اس کے ساتھ ان کے اپنے مفاد وابستہ ہوتے ہیں۔میں یہ مثال ہی کے طور پہ کہتا ہوں' ہر معالج یا ہر حکیم یا ہر طبیب یا ہر ڈاکٹر کے متعلق نہیں کہتا۔اس قسم کے بدنہاد بھی ہوتے ہیں' وہ ہمارے تجربے میں ہیں کہ ذرا سا دیکھا کہ اچھی جیب والا مریض پھنس گیا ہے۔بس اس کے ساتھ یہ کیا کہ پہلے دن تو ایسی دوائی دی کہ آدھا مرض جاتا رہا' وہ سبحان اللہ گرویدہ ہو جاتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ مرض کم ہونا شروع ہو جاتا ہے اور جب دیکھا کہ مرض بظاہر 10% رہا ہے تو پھر ایک ہی دن کچھ ایسا انجیکشن (Injection) دیا کہ چل پھر اس کو اسی کے اوپر چلائے جا رہے ہیں۔یہ کیوں اس کو اچھا ہونے دیں؟ دراصل ان کی جیب انہیں اچھا ہونے نہیں دیتی۔اس کے مرض کے ساتھ ان کے مفاد وابستہ ہو گئے ہیں کہ یہ اچھا ہو گیا تو میری روزی گئی۔اگر وہ اس کو مایوس کر دیں تو پھر بھی وہ چلا جائے گا۔نہیں' ایسا نہیں کرتے بلکہ اس کی امیدیں وابستہ رکھتے ہیں لیکن ان کی ساری کوشش یہ ہوتی ہے کہ مریض اچھا نہ ہونے پائے۔یہ ان کے مفاد ہوتے ہیں جو وہ اچھی جیب والے مریض سے وابستہ رکھتے ہیں۔

Marfat.com

میں تمہارے علاج کا تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا

آپ نے دیکھا ہے کہ قرآنِ کریم نے ہر رسول کی دعوت میں یہ کہا ہے۔ عَبُدَ اللّٰہِ (13:36)۔ پہلی بات یہ کہ خدا کی محکومیت اختیار کرو اور اسی سانس میں اگلی بات یہ کہ مَآ اَسۡـَٔلُکُمۡ عَلَیۡہِ مِنۡ اَجۡرٍ (26:109) میں تم سے کوئی معاوضہ نہیں چاہتا۔ بھئی! یہ شفا ہی اسی صورت میں ہو سکتی تھی۔ اب تو ہمارے ہاں کا نظام واقعی باطل ہے اگر معاوضہ نہ لیں تو یہ معالج' یہ بے چارے ڈاکٹر' کھائیں کہاں سے؟

معالج کے لیے اس کی روٹی کا انتظام

اچھے نظام کے زمانے میں ان کے لیے جائیدادیں وقف کر دی جاتی تھیں کہ تم یہاں سے کھاؤ اور اس کے بعد مریضوں سے کچھ نہ لو۔ دلی کے شریف خوانی خاندان' حکیم اجمل خان صاحب کے خاندان' ان سب کے نام جائیدادیں وقف تھیں۔ یہ مفت علاج کرتے تھے' یوں فائدہ ہوتا تھا۔

چین والوں کے ہاں مشروط فیملی ڈاکٹرز کا رواج تھا

یا پھر وہ طریق تھا' جو پرانے زمانے میں چین والوں نے اپنے ہاں اختیار کیا تھا۔ بڑے پرانے زمانے کی بات ہے' وہاں فیملی ڈاکٹرز ہوتے تھے۔ ڈاکٹر کی تنخواہ مقرر ہوتی تھی۔ جتنے دنوں کوئی شخص بیمار رہتا تھا اتنے دنوں کی تنخواہ کاٹ لیتے تھے۔ دیانتدار ڈاکٹر آدمی یہ چاہے گا کہ اس کا مریض جلد صحت یاب ہو۔ میری نگاہوں کے اندر ایسے بھی طبیب ہیں' جو دوائی بھی دیتے ہیں اور واقعی تنہائی میں دعا بھی کرتے ہیں کہ اس مریض کو اچھا ہو جانا چاہیے۔ میں کہہ رہا ہوں کہ باطل کے نظام میں کیا ہوتا ہے؟ وہ یہ ہوتا ہے کہ وہ طاغوت کے پنجے سے نکلنے ہی نہیں دیتے اور اس منزل کے اندر یہی سخت مرحلہ ہے صاحب! یاد رکھیے! مذہب سے نکل جانا اور دین کی طرف آنا بڑا مشکل ہے۔ شفاء یہ ہے کہ وہ جو آپ کا پہلا مرحلہ ''کفر بالطاغوت'' کا ہے' پہلے اس سے نکلے اور یہ تو قرآن ہی نکال سکتا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا فرمان

وہ جو اقبالؒ (1877-1938) نے اپنے ہاں ایک فقرہ لکھا ہے' کہنے کو تو وہ ایک ہی ہے لیکن بہت اہم فقرہ ہے۔ انہوں نے یہ کہا ہے کہ اس امت کی بیماریوں کا علاج صرف ایک ہے کہ ان میں کوئی مردِ قلندر اور مردِ درویش' جسے وہ کہتے ہیں جرأتوں کا مالک' عمرؓ کی روح لیے ہوئے اٹھے کہ جس نے نبی اکرم ﷺ کی حیات کے آخری سانس میں یہ کہہ دیا کہ حَسۡبُنَا کِتَابُ اللّٰہِ ۔ کہا کہ ''امت کو شفاء وہ شخص دے سکے گا۔ جو حسبنا کتاب اللہ کہنے کی جرأت کرے گا۔'' ٹھیک ہے بڑی مخالفت ہوگی' بڑے کفر کے فتوے لگیں گے' بڑی ڈگڈگیاں بجیں گی صاحب! یہ سب کچھ ہوگا لیکن یہ تو اسی صورت میں ہو سکے گا کہ وہ اس قرآن پر چلے۔ ضروری نہیں ہے کہ یہی قوم' جو آج اس کی مدعی ہے' اپنا نام مسلمان رکھے ہوئے ہے' قرآن کو یونہی دہرائے چلے جا رہی ہے' وہ یہی قوم ہو۔ قرآن تو قوموں سے واسطہ ہی نہیں رکھتا۔ قرآن نے یہ کہا ہے کہ اگر

Marfat.com

تم ان قوانین سے اعراض برتو گے تو کوئی بات نہیں' ہم تمہاری جگہ دوسری قوم لے آئیں گے۔ ثُمَّ لَا يَكُونُوٓا اَمْثَالَكُمْ (47:38)۔ پھر وہ تمہارے جیسی نہیں ہوگی۔ عزیزانِ من! سوال مسلم یا غیر مسلم کا نہیں ہے۔ قرآن تو ذکر للعالمین ہے۔ دنیا جب بھی تنگ آئے گی اور اس وقت اپنے غلط معاشرے اور نظام سے بڑی تنگ آئی ہوئی ہے' اس قرآن کی تعلیمات اور نظامِ زندگی کی طرف لپکے گی۔

اہلِ یورپ کی رقصِ بسمل اور ہماری حالتِ زار

آپ یورپ کے مفکرین کی کہیں آج کل کی کیفیت کا مطالعہ کیجیے' چیخ رہے ہیں جسے اقبالؒ (1877-1938) نے ان کا رقصِ بسمل کہا ہے کہ:

اکرم و جراحت ہائے پنہاں بسمل استاداست

ان کی یہ کیفیت ہو چکی ہے: تڑپ رہے ہیں' راستہ نہیں مل رہا۔ راستہ تو ہم نے دینا تھا جو قرآن کے مدعی تھے۔ ہم ہی باطل کے کفر سے نہیں نکل رہے' ہم انہیں کیا راستہ دکھائیں گے۔ میرا اندازہ یہ ہے عزیزانِ من! اگر میری جرأتیں معاف کی جائیں تو میں بلاخوف و خطر کہوں گا کہ مذہب پرست قوم سب سے آخر میں قرآن کی طرف آئے گی۔ اس لیے کہ انہیں غلط عقائد' غلط مناسک کے اندر ایسا مگن کر دیا جاتا ہے کہ یہ مطمئن ہو جاتے ہیں کہ یہ صحیح ہے۔ وہ اس لیے چیخ رہے ہیں اور ڈھونڈ رہے ہیں غلط عقائد اور غلط مناسک سے نکلنے کا راستہ۔ انہوں نے پہلے سے ہی یہ افیون' یہ مذہب تو چھوڑ دیا تھا' سیکولرازم پہ آ گئے ہوئے تھے۔ اس میں ان کو بڑا وقت لگا تھا۔

آپ ذرا یورپ کی تاریخ پڑھ کے دیکھیے کہ کلیسا اور چرچ سے پیچھا چھڑانے کے لیے ان کو کن کن کٹھن مراحل سے گزر کر نکلنا پڑا تھا۔ لیکن بہرحال' تین چار صدیاں ہو گئیں وہ وہاں سے نکل گئے۔ اس لیے اس راستے کی تلاش کے اندر وہ ہم سے آگے ہیں' جبکہ ہم اپنی ڈگر پر مطمئن ہیں' چپ بیٹھے ہیں۔ اگر ان کی کہیں کراہنے کی کوئی آوازیں بھی آتی ہیں تو ہم کہتے ہیں: دیکھا چھری کانٹے سے کھانے کا مزہ یعنی ہماری یہاں تک ہی نگاہ جاتی ہے۔ جسے ہم تاریخِ مغرب کہہ کے پھٹکارتے رہتے ہیں تو وہ پتلون' ٹائی' چھری' کانٹا' میز' کرسی ہے۔ اس سے آگے ہماری نگاہ ہی نہیں جاتی' یعنی ان کی نگاہ صرف ان چیزوں تک جاتی ہے جو یہ خود نہیں کرتے۔ ان کے نزدیک تو بس تہذیبِ مغرب اتنے ہی حصے تک ہے' باقی سب جائز اور حلال ہے۔ سوال یہ تو نہیں عزیزانِ من! طاغوت نے تو ہر غیر قرآنی نظریہ دیا ہے اور دین کے خلاف تصور دیا ہے۔ یہ قومیں تو اپنی اس بے سکونی کی حالت سے جلدی سے نکل سکتی ہیں۔ نظریہ آتا ہے کہ وہ حقیقت کی تلاش میں تڑپ رہی ہیں۔ اور اسی طرح میں یہ بات کہہ رہا تھا کہ جب آپ باطل کے امراض سے کفر برتیں گے' تو مرض سے شفاء ہو جائے گی اور پھر وہ کھوئی ہوئی توانائیاں حاصل ہونگی۔ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ (17:82)۔ یہ تو اس طرح ہوگا۔ لیکن جیسا کہ میں نے ابھی کہا تھا' بدہضمی کے زمانے میں اگر آپ پہلے معدے کو تقویتِ بہم نہیں پہنچائیں گے اور اس کے مرض کو دور نہیں کریں گے تو اس مریض کو دیا جانے والا وہ دودھ' جس نے توانائی دینی تھی' وہ مرض کو اور بڑھاتا چلا جائے گا۔ اگر اس دوران میں یہ چیزیں جنہیں آپ ٹانک کہتے

ہیں' بخار کے دوران دیدی جائیں' وہ دورانِ خون کو تیز کر دیں گی تو اس سے تو پھر سرسام (Delirium tremens) [1] ہو جائے گا۔ کہا کہ یہ چیز ہے' جو نقصان رساں ہے۔ مومنین کے لیے تو یہ ہوگا کہ جس طرح طلوعِ سحر شب کی تاریکی کے لیے موجبِ ہلاکت ہوتی ہے' اسی طرح صدق وعدل پر مبنی نظامِ خداوندی کے قیام سے' ظلم وستم کی قوتوں کی تباہی ہوتی ہے۔ اس لیے کہا کہ یاد رکھو: وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا (17:82)۔ وہ جو اس ظلم وستم کو ساتھ رکھتے ہوئے چلے گا' وہ ظلم وستم کی راہ اس کو الٹا نقصان پہنچائے گی۔

مومن ظالم نہیں ہوسکتا

کیا بات ہے قرآن کی! عزیزانِ من! یہاں کہا ہے۔ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ (17:82)۔ اس کے تقابل ومقابلے میں قرآن لایا ہے: وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ (17:82)۔ قرآن بالاضداد (By Juxtaposition) بات کو واضح کرتا ہے۔ مثلاً یہ نور کے مقابلے میں ظلم اور دھوپ کے مقابلے میں سایہ لاتا ہے۔ اضداد سے بات بڑی صاف ہو جاتی ہے' واضح ہو جاتی ہے۔ روشنی کیا ہوتی ہے؟ یہی کہ اندھیرا نہیں ہوتا۔ اس سے بات بڑی صاف ہو جاتی ہے۔ یہاں وہ مومنین کے بالکل مقابل ظالمین لایا ہے۔ بات صاف ہوگئی کہ ظالم مومن نہیں ہوسکتا۔ مومن ظالم نہیں ہوسکتا۔ قرآن تو انہیں ایک دوسرے کی ضد کہہ رہا ہے۔ یہاں ہمارے ہاں تو صرف مومن اور کافر کے ہی لفظ تھے۔ کافر کا بھی وہ تصور اپنے ذہن میں تھا' جو ہمارا نہیں تھا' وہ تو ہندو کا تھا' جو وہ وہاں انڈیا (India) میں ان کو چھوڑ آئے' یعنی کفر تو بس وہاں پر رہ گیا۔ مگر دیکھیے یہاں قرآن مومنین کے مقابلے میں کیا لایا ہے؟ وہ لایا ہے: وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا (17:82)۔ جو لوگ سرکشی برتیں گے اور ظلم وستم کی راہ اختیار کریں گے' ان کے سامانِ ہلاکت میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔

ظلم کا مفہوم

عربی زبان میں ظلم اسے کہا جاتا ہے کہ ''جو شے جہاں ہونی چاہیے' وہ وہاں نہ ہو''۔ تو یہاں اس آیت میں ظالم اور مومن کو ایک دوسرے کی ضد بتایا گیا ہے۔ اس سے قرآن اور خدا کا منشاء یہ ہے کہ چیزوں کو یوں ہونا چاہیے اگر ''وہ چیزیں جہاں ہونی چاہئیں وہاں نہیں ہیں''۔ تم نے غلط جگہ رکھی ہوئی ہیں اور آپ چاہتے ہیں کہ حق آجائے' قرآن سے شفا اور رحمت مل جائے' تو اس طرح کبھی شفاء اور رحمت نہیں مل سکتی۔ پہلے ان چیزوں کو اپنے اپنے ٹھکانے کے اوپر رکھیے' یہ ظلم کو ختم کر دیں گے۔ اس طرح چیزوں کو اپنے مقام پہ رکھ کر پہلے ظلم کو ختم کرو۔ اس کے بعد قرآن کے ہاں سے تمہیں شفاء بھی ملے گی اور رحمت بھی ملے گی۔ اِلَّا خَسَارًا۔ ورنہ سامان ہلاکت میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا اور یہ خسرانِ مبین ہوگا۔ لیکن کہا کہ انسان کی تو کیفیت یہ ہے' جو بار بار دہرایا کرتا ہے کہ وَاِذَآ اَنْعَمْنَا عَلَى الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَنَاٰ بِجَانِبِهٖ وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ كَانَ يَـُٔوْسًا (17:83)۔ جب انسان اپنے سامنے زندگی کا نصب العین یہی مادی اسباب ہی رکھے تو یہ نہیں ہے کہ یہ مادی اسباب قابل نفرت ہیں۔ نصب العین کے معنی ہوتا ہے کہ جس طریقے سے بھی یہ حاصل ہو جائے۔

[1] Qorland, 1989,p. 164

Marfat.com

دراصل مقصدِ حیات ہی ان کا حصول ہو۔ جب یہ کیفیت ہو جائے تو امید کے' دین کے' مایوسی کے' خوشی کے' اور غم کے' سارے کے سارے پیمانے (Measures) دھرے' کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ ''بیٹھے ہوئے ہیں صاحب! صف بچھا کے۔'' اجی کیا ہوا؟ سنیے عزیزان من! چار کارخانے بھی ہیں۔ دس بزنس ہاؤس بھی ہیں۔ یہ سب کچھ ہے۔ او بھئی! کیا ہوا ہے؟ کہ ''جی وہ بھاؤ بہت گر گیا ہے''۔ کاہے کا بھاؤ گر گیا ہے''؟ وہ جو کچھ سٹاک (Stock) کر کے رکھا ہے: اندر غلہ ہے' کاغذ ہے' سونا ہے۔ کہیں پتہ چلا ہے کہ امریکہ میں بھاؤ گر گیا ہے' یہاں ان کا دل ڈوب رہا ہے۔

زندگی کا نصب العین جب مادی قرار پا جائے تو پھر یہی حال ہوتا ہے

ان چیزوں کے اندر اضافہ ہوتے چلے جانا' ان کی زندگی کا نصب العین تھا۔ یہ ان کی ضرورت (Need) نہیں تھی' ضرورت کی تو اپنی ایک کیفیت ہوتی ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ ان کے بڑے بڑے دولت مند جب اس ہوس کے اندر اس قدر زیادہ ہوتے جاتے ہیں تو پاگل ہو جاتے ہیں' ان کا معدہ ہی جواب دے جاتا ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ روٹی (Loaf) کے پیچھے جو اس کا چھلکا سا ہوتا ہے' وہ اسے یونہی پانی میں ڈبو کے کھا رہے ہیں۔ کچھ ہضم ہی نہیں ہو رہا۔ اس لیے کہ ان کی ساری توانائیاں تو ہر وقت اس جال کے اندر صرف ہو رہی ہیں۔ اَنۡعَمۡنَا عَلَی الۡاِنۡسَانِ اَعۡرَضَ (17:83)۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ کیفیت یہ ہے کہ جب یہ چیزیں مل جاتی ہیں تو اس کے بعد کہاں کی اقدار' کہاں کے اصول' کہاں کے قوانینِ خداوندی' کہاں کی شرافت' کہاں کی مروت! اَعۡرَضَ وہ ہر ایک سے گریز کرتا ہے' پہلو تہی کرتا ہے' پیٹھ موڑ کے چل دیتا ہے۔ یہاں قرآن نے اس چیز کو اسی لیے مضمر رکھا ہے' تفصیل نہیں بتائی کہ کس چیز سے اعراض برتتا ہے: ہر وہ چیز جسے آپ باعثِ شرفِ انسانیت کہہ دیتے ہیں وہ اس سے اعراض برتتا ہے' اور پھر اپنے آپ کو باقی معاشرے سے مستغنی سمجھتا ہے لیکن حالت یہ ہے کہ وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ كَانَ يَـُٔوْسًا (17:83)۔ ذرا سا کہیں گھاٹا آ جاتا ہے' ہارٹ (Heart) فیل ہو جاتا ہے۔ یہ جو آپ ہارٹ فیل ہونے کی داستانیں سنتے ہیں' وہ یہی کچھ ہوتا ہے۔ بھوکوں کے ہارٹ فیل نہیں ہوتے۔ بھوک سے تو کبھی کسی کا ہارٹ ہی فیل نہیں ہوتا۔ دھکا یہ لگتا ہے کہ ''جی! بھاؤ گر گیا''۔ کروڑوں روپے جمع ہیں۔ بھاؤ ''گر گیا'' ایک دم سے وہ بھاؤ نہیں گرتا' اس کا قلب گرتا ہے۔ ہارٹ فیل ہو رہا ہے۔ وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ كَانَ يَـُٔوْسًا (17:83)۔ جب ان سے مال و دولت چھن جاتا ہے' ان پر مایوسیاں چھا جاتی ہیں' ان کی کیفت یہ ہے۔ یہ کیوں ہے؟ یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ اس کا جواب اگلی آیت میں بھی ہے۔ لیکن اس کے اندر آنے والے ایک لفظ مشکالت کے غلط معنوں نے ایک الجھن پیدا کر رکھی ہے۔

ہمارے ہاں مشاکلت کے لفظ کا غلط استعمال

عزیزانِ من! پھر یہاں وہی بات آ جائے گی' جس کے غلط مفہوم یا ترجمے نے بالکل قرآن کے خلاف ایک چیز پیش کر دی ہوئی

Marfat.com

ہے اور بڑی عظیم چیز ہے۔ قرآن کہتا ہے۔ قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ فَرَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ اَهْدٰى سَبِيْلًا (17:84)۔ عام ترجمہ یہ ہے کہ ہر ایک چیز اپنی اپنی ''مشاکلت'' کی رو سے کام کرتی ہے۔ تمہارا خدا جانتا ہے کہ کون زیادہ ہدایت پر ہے۔ مشاکلت ایک لفظ ہے۔ یہ کیا چیز ہے؟ ہمارے ہاں اس کا ترجمہ ''فطرت'' ہو گیا ہے ''طینت'' ہو گیا ''طبیعت'' ہو گیا ہے۔ ٹھیک ہے کسی سے کچھ بات ہی نہ کہو ہر شخص اپنے اپنے مزاج اور اپنی اپنی طبیعت کے مطابق کام کرتا ہے۔ میاں ٹھیک ہے: یہ رام بھی وہی اور رحیم بھی وہی ہے۔ مشاکلت کا ترجمہ فطرت کر کے انہوں نے آدمی کو انسان کو بااختیار سے مجبور بنا دیا۔ ''طبیعت'' یعنی وہ چیز جس پہ آدمی کا اپنا اختیار نہیں' یہ تو بنی ہوئی چیزیں آتی ہیں۔ بڑا گرم مزاج واقع ہوا ہے۔ ''واقع ہوا'' کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اس نے یہ مزاج خود نہیں بنایا' اس نے وہ مزاج پایا ہی ایسا ہے۔ کیا کیا جائے؟ یہ وہی ہے جسے ''طبیعت'' کہتے ہیں۔

نیکی علم کا نام ہے

''نیکی علم کا نام ہے''۔ بڑی عجیب غلط چیز ہے جو یہ شخص کہہ گیا ہے۔ یہاں اس نے خود ہی تردید کی ہے۔ مشہور و معروف یونانی فلاسفر سقراط (Socrates: C.469-399 B.C) نے کہا تھا کہ ''نیکی علم کا نام ہے۔'' کہا تھا کہ اگر کسی چیز کے متعلق علم ہو' معلوم ہو تو انسان بدی نہیں کرتا۔ یہ اس کا غلط نظریہ تھا۔ معلوم ہونے کا تعلق دماغ سے ہے۔ یہ بڑا ضروری ہے کہ معلوم ہو کہ شراب نقصان دہ ہے۔ یہ معلوم ہونا چاہیے لیکن صرف یہ جو علم ہے' یہ اس چیز کے لیے کافی نہیں کہ انسان اس سے اجتناب بھی کرے۔ آج کسے معلوم نہیں ہے کہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں' تباہ کن ہے۔ یہی نشہ آور چیزوں کو لیجیے۔ اسی شراب کو لیجیے۔ میں تو طبعی چیزوں کی بات کر رہا ہوں۔ کسے علم نہیں ہے کہ یہ نشہ آور چیزیں بڑی نقصان دہ ہیں۔ کسی کی بات نہیں بلکہ اس نے [1] تو خود ہی اپنے آپ کو یہ کہہ کے الگ کر لیا کہ ''جانتا ہوں کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔'' تو پھر آپ کیوں نہیں رکتے؟ کہ ''جی! طبیعت اِدھر نہیں آتی۔''

''طبیعت اِدھر نہیں آتی:'' مشاکلت کا مفہوم

چل بھئی! یہ ہمارے ہاں کے جتنے شاعر ہیں' یہ سارے کے سارے اس میں ڈوبے ہوئے ہیں کہ ''طبیعت اِدھر نہیں آتی'' اور جو طبیعت ہے یہ اپنی بنائی ہوئی نہیں ہوتی۔ کیا کیا جائے؟ طبیعت ادھر نہیں آتی۔ معاملہ ختم ہو گیا صاحب! مشاکلت کے معنی کہیں فطرت' کہیں طبیعت' کہیں طینت کیا۔ کہا کہ بدطینت واقع ہوا ہے' نیک طینت واقع ہوا ہے۔ یعنی اس میں اس کا اپنا کوئی دخل نہیں' حالانکہ قرآن بات بڑی عجیب کہہ گیا ہے۔ پھر وہی باتیں آ جاتی ہیں۔ میں تو جب عرب قوم کی اس چیز پہ آتا ہوں کہ انہوں نے یہ زبان کیسے بنائی تھی تو میں نے کہا ہے کہ مجھے تو لغت [2] مرتب کرنے کے عمل نے اس قوم کا گرویدہ کر دیا ہے کہ ایک ایک لفظ' اس کے ایک ایک مادے پر مجھے دنوں مہینوں غور کرنا پڑا کہ یہ بات کیسے آ گئی۔ اب میں یہ بتاؤں کہ یہ بات انہیں کہاں سے ملی۔

[1] مرزا اسد اللہ خاں غالب (1797-1869): جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد پر طبیعت اِدھر نہیں آتی [2] لغات القرآن

Marfat.com

یہ لفظ ہے مشاکلت۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ میدان میں گھاس واس بہت ہوتی ہے تو عام طور پہ اس میں گھوڑے باندھ دیتے ہیں۔ وہ ایک رسی لے کے گھوڑے کے پاؤں میں باندھتے ہیں۔ کہیں ایک کیلا ٹھوک دیتے ہیں اور اسی رسی کا دوسرا سرا اس کیلے کے ساتھ باندھ دیتے ہیں۔ اب وہ رسی جتنی لمبی ہوتی ہے' وہ گھوڑا اسی دائرے کے اندر چلتا ہے۔ اسے انگریزی میں Tether کہتے ہیں۔ یہ جو گھوڑے کو اس ایک رسی سے باندھ دیتے ہیں' جس کا دوسرا سرا (End) اس کیلے سے' کھونٹے سے بندھا ہوتا ہے' اس گھوڑے کے چلنے سے جو ایک امکانی دائرہ بنتا ہے' یہ لوگ اسے ''مشاکلت'' کہتے تھے۔ یہ بڑی عجیب چیز تھی جو انہوں نے کہہ دی۔ پھر وہی بات کہ اس لفظ کا مادہ (Root) ''ش ک ل'' ہے تو آپ کو معلوم ہے کہ اس سے ''شکل'' کا لفظ بنتا ہے تو آپ حیران ہونگے کہ وہ وہاں سے یہ بات کیسے لے آئے۔ اس کو کیسے مشاکلت کہا؟

عربوں نے مشاکلت کا یہ لفظ کیسے بنایا؟

عزیزانِ من! یہ بالکل اَن پڑھ قوم تھی۔ تہذیب وتمدن تو ایک طرف رہا' ابھی اس قوم میں لکھنا پڑھنا تک نہیں آیا تھا۔ کہتے ہیں کہ نزولِ قرآن کے زمانے میں مکہ' جو ان کے ہاں کا مرکزی شہر تھا' اس میں صرف سترہ آدمی لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ یہ کیا قوم تھی! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ ان کا ابن الحکمت کہاں سے آ گیا تھا۔ ارسطو (Aristotle: 384BC-322 BC) کا سب سے بڑا کارنامہ یہ مانا جاتا ہے کہ اس نے شے کی Definition کی تھی کہ ''کوئی شے تصور (Concept) سے بنتی ہے۔ پھر وہ تصور' فارم (Form) اختیار کر لیتا ہے' ایک شکل اختیار کرتا ہے۔ اصل چیز فارم (Form) ہی' یہ شکل ہے اور شکل کے معنی ہوتا ہے کسی حدود کے اندر آ جانا۔'' آپ دیکھتے ہیں ڈرائینگ کے اندر کسی بچے نے بھی لائن یوں کر کے کھینچی تو طوطا بن گیا۔ صاحب! یہ صرف لائنیں ہوتی ہیں۔ ان میں یوں کیا تو انہوں نے بکری بنا دی۔ تو لائنوں کو بدلتے چلے جاتے ہیں' حدود کو بدلتے جاتے ہیں' مختلف شکلیں اختیار کرتے چلے جاتے ہیں۔ اس نے یہ کہا تھا کہ ''فارم (Form) اصل چیز ہے۔'' یہ جو لائنیں کھینچتے ہیں' ان کو بڑی اہمیت ہے۔ ان کے ہاں بھی جو شکل تھی' یہ اَن پڑھ قوم اس پہ غور کر رہی ہے: شکل کیسے بنتی ہے اور وہ بنتی ہے حد بندی سے۔ جہاں جہاں بھی کسی چیز کی انہوں نے حد بندی کی تھی' اس مادے (Root) ''ش ک ل'' سے الفاظ بنائے۔ اسی سے ''مشاکلت'' بنا۔ اس فارم نے بھی اس کی حد بندی کر دی: کہاں شکل اور فارم؟ کہاں وہ گھوڑے یا اونٹ کی وہ رسی؟ لیکن چونکہ حد بندی کا بنیادی روٹ (Root) اس کے اندر موجود ہے' اس لیے انہوں نے اس کو ''مشاکلت'' سے تعبیر کیا۔ عزیزانِ من! اور قرآن کا اعجاز ہے۔ دنیا کی یہی زبان تھی عزیزانِ من! جو قرآن کے حقائق کی متحمل ہو سکتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک بھی جو دنیا کی زبانیں ہیں' کسی زبان میں بھی قرآن کا ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا۔ عربوں کی بنائی ہوئی زبان اور خدا کا کیا ہوا انتخاب' کیسا عمدہ ہے! اور کیسا عمدہ ہے مشاکلت! سوال یہ پیدا ہو گیا کہ گھوڑے کو رسی تو ہم نے باندھی ہوئی ہوتی ہے' حد بندی ہو گئی۔ اسی دائرے کے

اندر وہ چر سکتا ہے۔ یعنی اس کا میدانِ عمل محدود ہو گیا' یوں کہہ لیجیے۔ تو کیا اس کے یہ معنی ہو گئے کہ یہ میدانِ عمل خود خدا نے محدود کر دیا ہے؟ قرآن پاک نے عَلٰی شَاکِلَتِہٖ (17:84) کہا ہے۔

انسان خود ہی اپنے پاؤں کو مختلف رسیوں کے ساتھ باندھ لیتا ہے

قرآن نے کہا یہ ہے کہ ہر شخص اپنے لیے خود پاؤں میں کچھ رسیاں باندھ لیتا ہے اور خود ہی اپنے ''اختیار'' پہ ''جبر'' کا پہلو غالب کر لیتا ہے اور پھر کہتا ہے: ''میں کیا کروں صاحب! میری تو رسی ہی اتنی بڑی ہے''۔ اللہ اکبر' سارا راز اس میں ہے عزیزانِ من! یہ جو ہم نے اپنے پاؤں میں آپ رسیاں باندھی ہوئی ہوتی ہیں' بڑی غور و فکر کی چیزیں ہیں۔ افراد' کچھ اپنی ہی باندھی ہوئی رسیوں میں گرفتار ہیں۔ یہ ان کی اپنی رغبتیں' اپنی خواہشیں' اپنی آرزوئیں' اپنے مقاصد' اپنے انفرادی مفادات ہیں۔ ذرا اس سے آگے بڑھتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ معاشرے کی رسیاں بندھی ہوئی ہوتی ہیں۔ انہوں نے انسانوں کو باندھ رکھا ہوتا ہے۔ ان کا جو منشاء اور یا للعجب جو مفاد ہوتا ہے اس کے مطابق اس ''گھوڑے'' کے پاؤں میں رسی باندھتے ہیں۔ ہم آگے بڑھتے ہیں تو ہمارے سامنے یہ غلط مذہب کی دنیا آتی ہے' اس کی مشاکلت! اُف وہ معاشرے میں تو زیادہ سے زیادہ رسی ہی باندھتے ہیں لیکن یہ مذہب تو زنجیریں باندھتے ہیں۔ یہ ہے مشاکلت۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو صاحبِ اختیار و ارادہ پیدا کیا ہے۔ اس کے لیے یہ واضح کر دیا کہ یہ چیزیں' یہ حدیں' تیرے لیے فائدہ مند ہیں' اور وہ تمہارے لیے نقصان دہ ہیں۔ ان نقصان رساں حدوں کی وضاحت خود کر دی اور اس کے بعد اسے چھوڑ دیا کہ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (18:29)۔ جس کا جی چاہے اِس کو اختیار کرے' جس کا جی چاہے اُس کو اختیار نہ کرے۔ جہاں تک اس کا جی چاہتا ہے' وہ کرتا چلا جائے۔ اِس عمل کرنے کے میدان کو ہم نے وسیع کر کے رکھ دیا ہے۔ اب وہ جہاں تک اپنی رسی کو چاہتا ہے' اپنے پاؤں میں آپ باندھتا رہتا ہے اور پھر خود ہی اس کا ذمہ دار (Accountable) بنتا ہے۔

حدود اللہ کا مقصد تو انسان کو منزلِ مقصود تک پہنچانا ہے

باقی رہا یہ کہ یہ جو خدا نے حدود یا حد بندیاں کی ہیں' ان کے متعلق بھی یہی کہا: لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (2:286)۔ ہم جو کسی کو یہ کہتے ہیں کہ ''یہ کرو اور اس سے آگے نہ بڑھو'' تو یہ اس لیے ہوتا ہے کہ اس سے اس کے عمل کی وسعتیں زیادہ ہو جاتی ہیں۔ میں وہ مثال دیا کرتا ہوں کہ جب نہر میں سست رفتاری پیدا ہو جاتی ہے' تیزی سے نہیں چلتی تو اس کے راستے میں پتھروں کی ایک ٹھوکر بنا دیتے ہیں۔ وہ ٹھوکر (Fall) اس نہر کا راستہ روکنے کے لیے نہیں ہوتی۔ وہ اس لیے ہوتی ہے کہ اس کی روانی میں' اس کی رفتار میں' اور تیزی پیدا کر دے۔ یہ نہریں' یہ ندیاں' سمندر تک اس طرح سے پہنچتی ہیں کہ راستے میں یہ ٹھوکریں لگائی جاتی ہیں۔ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (2:286)۔ ہم نے جو انسان کی ندی کے راستے میں' جگہ جگہ کچھ تھوڑی سی' جائز و ناجائز کی' حرام و حلال کی

حد بندیوں کی ٹھوکریں لگائی ہیں تو یہ اس لیے ہیں کہ ہر ٹھوکر سے اس کی امکانی وسعتیں اور زیادہ ہو جاتی ہیں۔ اس کی مشاکلت کی رسی اور بڑھ جاتی ہے صاحب! نبی اکرم کا ہے کے لیے تشریف لائے: وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ (7:157)۔ کیا منصب نبوت؟ عزیزانِ من! یہی منصب ہے جس کی بناء پہ حضورؐ رحمت للعالمین قرار پائے ہیں۔ کیا کہا ہے حضورؐ نے چار لفظوں میں؟ کہا کہ وہ جو بڑی بڑی بوجھل سلیں' جو انسانوں نے اپنے سر پر خود ہی رکھی تھیں اور نیچے بیٹھ گئے' کانپ رہے تھے کہ صاحب! رو رہے ہیں' اٹھا نہیں جا سکتا' اتنی بوجھل چیزیں۔ کہا: یہ رسول ﷺ انسانیت کو حریت کا سبق دینے کے لیے آئے' اس نے ان تمام سلوں کو اٹھا کر پھینک دیا صاحب! وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ (7:157)۔ اور انہوں نے جو اپنے اپنے پاؤں میں اس قسم کی مشاکلت کی رسیاں خود ہی باندھ رکھی تھیں' اس رسول نے انہیں کاٹ کے پھینک دیا۔ یہ ہے عزیزانِ من! رسالت کا مرتبہ! بعض خدا کی متعین کی ہوئی حدود باقی رہیں اور وہ اسی لیے رکھی گئیں کہ اس کی سعی و عمل کی رفتار اور تیز ہو جائے اور باقی ساری رسیاں کاٹ دیں' باقی ساری سلیں اٹھا کے پھینک دیں صاحب! حریتِ انسانیت کا سبق دینے کے لیے قرآن آیا تھا اور آپ دیکھیے قرآنِ کریم میں' میں نے کہا ہے کہ یہ رسیاں تو خدا نے خود تجویز کر کے پاؤں میں نہیں ڈال دی تھیں۔

دیکھیے سورۃ مدثر 74' ایک دفعہ تو ہم ان سورتوں سے گذر چکے ہوئے ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ جلدی جلدی یہ سامنے آ جائیں۔ قرآن کے آخری پارے کی یہ سورتیں تو پوچھو نہیں کیا ہیں! نچوڑ ہیں ساری تعلیم کا۔ بہر حال یہ کہا ہے: لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّتَقَدَّمَ اَوْ يَتَاَخَّرَ (74:37)۔ یہ سب اس لیے ہے کہ ''تم میں سے جس کا جی چاہے' آگے بڑھ جائے جس کا جی چاہے پیچھے رہ جائے۔'' کیا بات ہے! لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ (74:37)۔ مشیت انسان کی کام کر رہی ہے۔ ٹھیک ہے ہمیں کھلا ہوا میدان دیدیا ہے۔ لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّتَقَدَّمَ اَوْ يَتَاَخَّرَ (74:37)۔ جس کا جی چاہے آگے بڑھ جائے جتنا جی چاہے آگے بڑھ جائے' جس کا جی چاہے پھسڈی رہے' پیچھے رہ جائے۔ بھئی یہ کس طرح سے ہوگا؟

ہر انسان اپنے اعمال کے ہاتھوں آپ گروی ہوتا ہے

سنیے عزیزانِ من! اگلے چار لفظ ہیں: كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ (74:38)۔ ہر شخص اپنے اپنے اعمال کے ہاتھوں اپنے آپ کو گرویدار کر دیتا ہے' گروی (Mortgate) رکھ لیتا ہے' ہر شخص اپنے ہی اعمال کے شکنجے میں جکڑا ہوتا ہے۔ کیا لفظ ہے صاحب! رھین: اپنے آپ کو گروی (Mortgage) رکھ دیتا ہے۔ گروی رکھ دینے کی یہ بدترین شکل ہوتی ہے' یعنی ویسے ہی بیچ دیا جائے تو قصہ ختم ہو جاتا ہے۔ وہ رہن رکھی ہوئی چیز ملکیت تو اسی کی ہوتی ہے' قبضہ وغیرہ اس کا اپنا کچھ نہیں ہوتا' اختیار کچھ نہیں ہوتا۔ ملکیت بدستور موجود ہے' ملکیت تو رہے گی مگر اس پر اپنا اختیار و اقتدار نہیں رہے گا۔ اختیار اس کو کوئی نہیں ہے: ''رھینة''

Marfat.com

عزیزانِ من! اس سے تو اچھا تھا: بک جاتا مگر یہ تو اپنے اعمال کے عوض اپنے آپ کو گروی رکھتا ہے۔ اگر بک جاتا تو ''سیاپا تے مکدا''[1] قصہ ختم ہو جائے گا' مگر نہیں' ہرگز نہیں۔ ملکیت تو رہے گی مگر اس پر اپنا اختیار و اقتدار نہیں رہے گا۔

رہن رکھا مال تو بک نہیں سکتا

بکتا نہیں ہے' اپنے آپ کو رہن رکھتا ہے۔ اپنے آپ کو اپنے اعمال کے عوض گرَوی رکھتا ہے۔ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ (74:38)۔ گروی رکھے ہوئے ہیں۔ یہاں تو میں سمجھتا ہوں کہ فارسی والوں نے یہ بہت اچھا لفظ لیا ہے۔ آپ نے کبھی غور بھی فرمایا ہوگا گروی کا لفظ تو ہمارے ہاں روزانہ استعمال ہوتا ہے۔ گروی تو کسی چیز کا گرویدار ہونے کو کہتے ہیں' اور گرویدار تو آپ سمجھے ہیں کہ گرویدہ ہو گیا یعنی ''میں تو اسی کا ہو گیا''۔ گرویدہ ہو گیا۔ انتہائی رغبت کو کہتے ہیں۔ انسان اپنے آپ کو گرویدہ کیسے کر لیتا ہے؟ کوئی مطلب' کوئی مقصد' کوئی خواہش' کوئی آرزو' اتنی شدت اختیار کر جائے کہ ہم کہیں کہ وہ اس کا گرویدہ ہو گیا ہے صاحب! اس نے اپنے آپ کو گروی رکھ دیا ہے۔ بظاہر نظر آتا ہے کہ وہ اپنے آپ کا آپ مالک ہے' لیکن آپ مالک نہیں ہوتا۔ انہوں نے بھی یہ گرویدہ سے گروی کا لفظ بہت اچھا رکھا ہے۔ قرآن ہی سے لیا ہے: رھینۃ اس کے ہاں رہن کا لفظ ہے۔ کن چیزوں سے یہ رسیاں کھینچی ہوتی ہیں؟ جن چیزوں کی رغبت' جن چیزوں کی خواہش اور آرزو شدت سے آپ پیدا کر لیں یعنی یہ اپنے جو مفادات ہیں' ان کی وجہ سے جتنے شدید ہوتے چلے جائیں گے انسان اپنے آپ کو ان کے پاس رہن رکھتا چلا جائے گا۔ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ (74:38)۔ اب کوئی دوسرا تو چھڑا نہیں سکتا۔ رہن رکھے ہوئے مال کے پیسے تو آپ کو ہی ادا کرنے پڑیں گے' اور جتنا لمبا عرصہ ہوتا چلا جائے' سود بڑھتا چلا جائے گا عزیزانِ من! یہ ہے مشاکلت: بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ (74:38)۔ اپنے آپ کو رہن رکھ دینا' کسی نے سو روپے میں رہن رکھ دیا' کسی نے ہزار روپے میں رکھ دیا' کسی نے دس ہزار میں رکھ دیا۔ یہ تو ساری بات' ساری اس رقم کی ہوئی۔ رہن اور گروی کر دینا تو یکساں ہوتا ہے۔

بظاہر مالک خود ہیں لیکن قبضہ دوسرے کا ہے

سوچیے عزیزانِ من! ہم نے اپنے آپ کو کس کس شکل میں گروی رکھا ہوا ہے۔ کسی نے کتنے پہ رکھا ہوا ہے' کسی نے کتنے پہ۔ آج ہر شخص ہم میں سے گروی ہے۔ بظاہر ہم مالک ہیں لیکن قبضہ کسی اور کا ہے۔ اس کے تابع ہم چلنے پہ مجبور ہو رہے ہوتے ہیں۔ سچ کہا تھا قرآن نے کہ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ (74:38)۔ ہر شخص اپنے ہی اعمال کے شکنجے میں جکڑا ہوتا ہے اور انہی کی وجہ سے اس پر مصیبت آتی ہے۔ انہی اعمال کے ہاتھوں گروی رہتا ہے۔ اسی طرح غلط کار الگ بھی مصیبتوں میں گرفتار۔

---

[1] مصیبت تو ٹلتی' معاملہ تو ختم ہو جاتا ہے' جان تو چھوٹ جاتی۔

سعی وعمل کے میدان کو انسان خود وسیع کرتا ہے

سعی وعمل کے میدان کو انسان خود وسیع کرتا ہے۔ میں نے ابھی ابھی یہ عرض کیا کہ رسول اللہؐ کی بعثت اور ان کے توسط سے قرآن کا نزول تو ہوا ہی اسی لیے تھا کہ انسان حریت کے راستے میں ڈلی ہوئی زنجیریں کاٹ کے پھینک دے۔ اس طرح اس بعثت رسول اللہ نے تو آزاد کر دیا لیکن قرآن نے مختلف مقامات پہ جحیم کی بات بھی کی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس لفظ جحیم کے مادے میں ''روک'' کا مفہوم ومعنی ہیں۔ یہ لفظ ''ج ح م'' سے ہے۔ اس کے معنی روک ہوتی ہے' رک جانا ہوتا ہے۔ یہ جو رکاوٹیں ہم اپنے راستے کے اندر کھڑی کر لیتے ہیں' یہ ہم انفرادی طور پہ کرتے ہیں' یا غلط معاشرہ' غلط نظام آپ کے راستے میں کھڑی کر دیتا ہے' کچھ بھی ہو' یہ جو آپ کے لیے آگے بڑھنے کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی ہو جاتی ہیں' وہ جحیم ہے عزیزانِ من! اب اس کے مقابلے میں دوسری چیز ''جنت'' آنی چاہیے۔ اس میں کیا کیفیت ہوتی ہے۔ سورۃ المطففین (83) کی آیات 22 تا 28 اس کی غماز ہیں۔ جن کی آگے بڑھنے کے راستے میں کھڑی رکاوٹیں نکل جائیں گی وہ ''ابرار'' ہوں گے' بڑی وسعتوں کے مالک' زندگی کی راحتوں اور آسائشوں سے بہرہ یاب' طمانیتوں کی پیدا کردہ شگفتگی وشادابی چہروں سے ہویدا' اختیارات واقتدارات کے تختوں پر متمکن۔ انہیں زندگی کی توانائیوں کے لیے بادۂ خالص ملے گا۔ وہ اپنے اندر صفات خداوندی کو (علی حدِ بشریت) منعکس کریں گے۔ ان کے لیے بادۂ رحیق ہوگا۔ یہ بادۂ رحیق ہے جسے عام زبان میں شراب ہی کہتے ہیں۔ بہرحال یہ تو ہمارے ہاں کی شراب ہے۔ عربوں کے ہاں تو ہر پینے والی چیز ہوگی۔ اپنی زبان میں اس کو شراب کہا جائے گا۔ لفظ مشروبات (Refreshments) کو تو ہم بھی استعمال کرتے ہیں۔ اس میں معنی پینے والی چیز کے ہوتے ہیں۔ لیکن اب تو شراب اصطلاحی لفظ بن گیا ہے۔ اب یہ اسی کے لیے ہے جسے ہم شراب یا وائن (Wine) کہتے ہیں۔ لیکن عربی زبان میں یہ صرف اِس شراب یا وائن (Wine) کے لیے استعمال نہیں ہوتا۔

عربی میں ہر اس چیز کو' جو پینے کے لیے ہو' شراب کہتے ہیں

یہاں قرآن نے یہ کہا ہے کہ اس میں پینے والی وہ چیزیں ہونگی جن سے تقویت ملے گی' ''نشہ'' ہوگا۔ لیکن یہ چیز وہ نشہ آور ہونا نہیں ہے جس سے انسان کی رہی سہی توانائیاں' حرکت' قوتِ عمل' بھی مغلوب ہو جاتی ہے: ''بیٹھے ہوئے ہیں منہ اٹھا کے''۔ اگر ایسا نہیں تو کوئی دوسری چیز کھائی جاتی ہے جس سے وہ کیفیت پیدا کی جاتی ہے: ''جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن''۔ اسی نشے میں کہتا ہے کہ بہت فرصت چاہتا ہے کوئی بڑے کام کرنے کے ہونگے' ہاں! فرصت کہ رات دن کوئی اور کام نہ ہو۔ فرصت کے رات دن؟ کہ بھئی وہ کاہے کے لیے؟ کیا کرو گے؟ ''بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے''۔ [1] فرصت کے رات دن ''افیم کھان واسطے چہیدے ہیگے نیں''[2] کہا کہ یہ نہیں۔ اس میں تقویت بخش مرکب ہیں۔ یہ وہ نشہ نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ایک دوسری چیز بھی ہوتی ہے جسے ہم مشک

---

[1] دیوان غالب میں یہ شعر یوں نقل ہوا ہے: ... جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن ... بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے

[2] وہ فرصت کے رات دن جو کہ افیون (Opium) کھانے کے لیے چاہیے ہیں۔

Marfat.com

کہتے ہیں، جس کے متعلق طبیب آپ کو بتائیں گے کہ یہ دورانِ خون میں انتہائی تیزی پیدا کرنے کے لیے، عمل کی قوتوں میں زیادہ گردشیں پیدا کرنے کے لیے ہے۔ ہمارے ہاں طب میں ایک جزوِ اعظم ہوتا ہے، یہ طبیب اسے مشک کہتے ہیں۔ اس کے متعلق آپ نے سنا ہوگا کہ کمبخت یہ بڑی تیز چیز ہوتی ہے۔ آج تو آپ کے ہاں اس کا سوال ہی نہیں ہے "ہن تے تہانوں ہر چیز وچ مُشک آندی ہیگی اے۔" اب تو گھوڑے کی لید کو مشک کہتے ہیں" ❶ لیکن جس زمانے میں کہیں سے یہ مشکِ خالص مل جاتی تھی، مجھے اس کا تجربہ ہے، ذرا سی مشک شیشی کے اندر ڈال کے جیب میں رکھی، تھوڑے عرصے کے بعد ناک سے خون آنا شروع ہوگیا۔ یہ ایسی تیز تھی۔ یہ چیز ان عربوں کے ہاں حرکت میں تیزی لانے والی، زیادہ متحرک کرنے والی اور زیادہ سرگرمِ عمل کرنے والی سمبل (Symbol) ہے۔ قرآن نے کہا کہ جحیم تو روک ہے۔ یہ مضمحل کرنے والی چیز اور پھنسا دینے والی چیز ہے۔ یاد رکھیے، جنت اور جہنم کے سلسلے میں یہ سارے بیانات تمثیلی ہیں۔ وہ سچ مچ پیالے میں کچھ نہیں ڈالا ہوا ہوتا لیکن تمثیلات کے درجے میں قرآنِ کریم اس پینے والی چیز کو کہتا ہے کہ خِتٰمُهٗ مِسْكٌ (83:26)۔ اس کے اندر کیا چیز ہوگی، اسے تو چھوڑ دیجیے۔ بادۂ رحیق کو جو ہم نے مشک سے سربند (Seal) کیا ہے۔ اس میں کیا چیز ہے؟ وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ (83:26)۔ اس میں وہ شے ہے جس سے جو جتنا آگے جانا چاہے، جاتا جائے، چلتا جائے، بڑھتا چلا جائے۔ یہ جنت کی تمثیلی کیفیت ہے۔ تو مشاکلت خدا کی باندھی ہوئی کوئی رسی ہے۔ وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ (83:26)۔ اسمیں زندگی اور توانائی کو بڑھانے کے اسباب وعناصر ہیں جن کے حصول کے لیے تمہیں ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی کوشش کرنی چاہیے۔

جنت کی تشبیہات کی اہمیت

اور آگے ہی بڑھنا نہیں، ان آبگینوں کی مہریں (Seals) بھی تقویت بخش عناصر (مشک) سے مرکب ہوں گی۔ وَمِزَاجُهٗ مِنْ تَسْنِيْمٍ (83:27)۔ ایک تو یہ کہ اسے سلسبیل کہا ہے بلکہ یہاں بھی اگر آپ آئیں گے تو بات دوسری طرف چلی جائے گی۔ ایک تو یہ کہ اس میں مزاج کافور کا ہو اور دوسرا مزاج یہ کہ اس میں حرکت لانے والی چیز ہے جسے طبیبوں کے ہاں زنجبیل اور طب میں ادرک کہتے ہیں۔ یہ زنجبیل بڑی حرکت لانے والی چیز ہوتی ہے۔ دورانِ خون کو کم سے کم تر کرنے والی چیز ان کے ہاں کافور ہوتا ہے اور حرکت لانے والی چیز زنجبیل ہوتی تھی۔ اب بھی معجونِ زنجبیل ہوتی ہے۔ طب میں جوارش تیز کرنے والی ہوتی ہے اس سے آگے مشک والی بات ہوتی تھی۔ سلسبیل ہوتی ہے، جس میں ہموار راستوں کے اندر روانی کا سوال ہوتا ہے، برادرانِ عزیز! قرآن کی یہ اصطلاحیں یا جنت کی تشبیہات نیک اعمال ہیں۔ یہ انسان کے دوسروں کی کمیوں کو پورا کرنے والے کام، انسان کے دوسرے انسانوں کے ساتھ حسنات ہیں۔ دراصل یہ

---

❶۔ اب تو آپ کو ہر چیز میں مشک یعنی بدبو آتی ہے، یہاں تک کہ اب گھوڑے کی لید کو بھی مشک کہنے لگے ہیں۔

Marfat.com

اُس سلسبیل کی مانند ایک ندی ہے' دروازوں کے آگے سے گذرنے والی ایک جوئے رواں ہے' جو پکارتی' راستہ کاٹتی ہوئی' پوچھتی چلی جائے: ''بھئی! پانی دی کنوں لوڑ ہیگی اے' لے لو''[1] پوچھتی ہے' دروازوں سے گذرتی ہوئی' آوازیں دیتی جائے گی کہ ''لے لو جس کو جتنی ضرورت ہے۔'' لیکن یہ تو پھر بھی ہموار راستے پہ چلنے کی بات ہے۔ کہا: مِزَاجُهٗ تَسْنِيْمٍ (83:27)۔ یہ جو پہاڑوں سے گرنے والی' یہ جو بلندیوں سے آنے والی چیز ہوتی ہے' اُسے تسنیم کہا جاتا ہے۔ دیکھیے اس میں رفتار کی تیزی ہوتی ہے اور ارتقاء اور بلندیوں کی طرف لیجانے والا رخ ہوتا ہے۔ اس لیے قرآن نے خدا کو رب ذِی الْمَعَارِجِ (70:3) کہا ہے یعنی سیڑھیوں والا' نشوونما دینے والا۔ نشوونما صرف صحن کے اندر ہی نہیں دیتا' وہ ہر حال میں دیتا ہے۔ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ (83:26)۔ جس نے آگے بڑھنا ہے' بڑھتا چلا جائے اور دوسری جگہ (5:48) میں اس کو مسابقت بھی کہا ہے۔ احتیاطاً باتیں سامنے آ رہی ہیں' لکھتے چلے جایئے۔

يٰٓاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا اِنِّىْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ (23:51)۔ طیبات کرو' عملِ صالح کرو۔ اس سے کیا ہوگا۔ اُولٰٓئِكَ يُسٰرِعُوْنَ فِى الْخَيْرٰتِ (23:61) ۔ اس سے یہ ہوگا کہ خیرات اور عطیات سے تمہارے اختیارات میں مزید وسعتیں آتی چلی جائیں گی۔ وَهُمْ لَهَا سٰبِقُوْنَ (23:61)۔ اور اس میں سبقت کرتے چلے جاؤ گے' بڑھتے چلے جاؤ گے۔ لہٰذا انسان کے لیے میدانِ عمل کھلا چھوڑ دیا عزیزانِ من! اس نے رکاوٹوں کی رسیاں کاٹ کے رکھ دیں۔ قرآن نے یہ چیزیں نشوونما کے لیے دیں۔ وہ اس لیے دیں کہ بڑھتے چلے جاؤ۔ جس نے جہاں تک بڑھنا ہے' وہ وہاں تک بڑھتا چلا جائے اور جس کا جی چاہے' اپنے پاؤں میں آپ مشاکلت ڈالتا چلا جائے۔ سوال تو یہ ہے کہ قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ (17:84)۔ انسان نے اپنے پاؤں میں جو زنجیریں پہن رکھی ہیں' یہ انہی کا گرویدہ ہو کے رہ جاتا ہے اور اس کے بعد یہ ہے کہ فَرَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ اَهْدٰى سَبِيْلًا (17:84) ۔ پھر ہم جانتے ہیں کہ کون کس راستے پر چل رہا ہے۔ جبکہ انسان تیز رفتاری کے ساتھ منزل تک پہنچنے کے لیے غلط راستے پر بھی تو چلتا رہتا ہے۔ راستے کا صحیح ہونا بھی تو ضروری ہے۔ یہ راستے کی صحت ہی تو سبیل کہلاتی ہے۔

غلط راستے پر چلنے کے لیے انسان بڑا تیز واقع ہوا ہے

اپنے اپنے اختیارات کے مطابق سب چلتے ہیں۔ یہ تو علمِ خداوندی' قانونِ خداوندی ہے' جو جانتا ہے کہ چلنے والا' صحیح راستے پہ بھی چل رہا ہے یا غلط راستے پہ چل رہا ہے۔ باطل کے معاشرے کے اندر حرکت تو بہت ہوتی ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ لوگ پاگل ہوئے ہوئے پھرتے ہیں لیکن یہ کوئی نہیں دیکھتا کہ ''صحیح راستے پر گامزن ہیں یا غلط راستے کے اوپر دوڑے چلے جا رہے ہیں۔'' غلط راستے پہ جتنی تیزی سے دوڑے گا' اتنا ہی زیادہ منزل سے دور ہوتا چلا جائے گا۔ رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ اَهْدٰى سَبِيْلًا (17:84) ۔

---

[1] او بھائیو! جنہیں پانی کی ضرورت ہے' وہ لے لیں۔

Marfat.com

اس کا علم خدا کو ہوتا ہے کہ ان میں سے کون زندگی کی سب سے زیادہ سیدھی راہ پر چل رہا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جو لوگ قوانین خداوندی پر چلتے ہیں' وہ زندگی کی سیدھی راہ پر ہوتے ہیں اور یہ جو قرآن ہے' یہ جو ہدایت کا راستہ ہے' یہ وحی کے ذریعے ملا ہے۔ یہاں وحی کی بات آ گئی' قرآن کی بات آ گئی۔ ذہن میں فوراً سوال پیدا ہوا کہ وحی کی حقیقت کیا ہے؟

ہمارے ہاں روح کا عام تصور

وحی کی حقیقت و ماہیت کیا ہے؟ وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ (17:85)۔ ہمارے ہاں اس کا عام ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ اس سے روح کی بابت پوچھتے ہیں۔ اور پھر ہمارے ہاں روح کا تصور تو یہ ہے کہ روح انسان کے اندر ہے۔ یہ ہر ایک کہتا ہے اور یہاں اس کا یہی ترجمہ کیا جاتا ہے۔ پھر اس کے یہ معنی کیے جاتے ہین کہ یہ تم سے روح کی بابت پوچھتے ہیں۔ لہٰذا بظاہر اس میں دکھائی یہ دیتا ہے کہ یہاں آیات میں کوئی باہمی ربط نہیں رہا' کیونکہ یہاں باتیں تو قرآن میں وحی کی ہو رہی تھیں' راستے کی ہو رہی تھیں اور اس میں چلتے چلتے یہ روح کی بابت پوچھنے کا کہاں سے آ گیا۔ لیکن ایسا تو ہے نہیں کہ ''جیدا جی چاہے جو مرضی پوچھ لیا اے' توں ایدی گل کر۔'' ❶ نہیں بات یہ ہے ہی نہیں۔

روح کا مروجہ تصور یونان کا دیا ہوا ہے' قرآن کا نہیں

جسے ہم روح کہتے ہیں' جس کا انگریزی میں ترجمہ Soul ہوتا ہے' جس کو انگریزی میں Spirit بھی کہتے ہیں' یہ سارے ان لوگوں کے یونانی تصورات تھے' قرآنِ کریم' تو جو تصوراتِ روح ان لوگوں نے پیدا کیے تھے' ان میں روح سے گفتگو ہی نہیں کرتا۔ اس کے لیے تو اس نے اپنے ہاں ایک لفظ ''نفس'' استعمال کیا ہے' جسے آپ ذات کہتے ہیں' شخصیت کہتے ہیں' Self کہتے ہیں' Personality کہتے ہیں' روح کا مروجہ تصور غیر قرآنی ہے۔

روح کے لیے خودی کی اصطلاح درست نہیں' اصل مفہوم نفس ہے یا انسانی ذات یا پھر وحی ہے

آج کی اصطلاح میں اقبالؒ (1877-1938) نے خودی کہا ہے۔ عام طور پہ یہ خودی Personality کہی جاتی تھی۔ یہ بڑا غلط تصور ہے۔ اس کے لیے تو قرآن کے ہاں ''نفس'' کا لفظ ہے' جسے انسانی ذات کہتے ہیں۔ یہ وہی ہے جو جسم کے ساتھ فنا نہیں ہوتی' مرتی نہیں' آگے جاتی ہے۔ روح کے مروجہ تصور سے تو پھر درمیان میں کئی ایک افسانے Fictions آ جاتے ہیں۔ قرآنِ کریم میں روح کا لفظ وحی کے لیے استعمال کیا ہے۔ اسکے بنیادی معنی توانائی (Energy) کے ہوتے ہیں۔ یہ اس قسم کی توانائی ہوتی ہے جو حواس کے اندر ہوتی ہے۔

---

❶ جس کا جی چاہا' جو مرضی میں آیا' پوچھ لیا۔ اور کہا کہ اس کی بات کرو۔

Marfat.com

بہرحال' اس لفظ کو قرآنِ حکیم نے اپنے ہاں اصطلاح کے طور پہ' وحی کے لیے' استعمال کیا ہے کیونکہ وحی سے مقصود یہی ہے جو ہم ابھی تک گفتگو کرتے چلے آ رہے ہیں کہ یہ انسان میں عمل کی قوتوں کو بڑھاتی ہے' یہ صحیح راستے پہ لگا دیتی ہے' توانائیاں زیادہ پیدا کر دیتی ہے۔ اس لیے خدا نے اس لفظ کو وحی کے لیے بھی استعمال کیا ہے۔ اس کے لیے دو ایک ریفرنسز (References) دیکھ لیجیے اور جب تبویب القرآن ❶ چھپ کر آئے گی تو اس میں آپ یہ ریفرنسز دیکھیں گے۔ سورۃ النحل کی دوسری آیت ہے۔ يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ اَنْ اَنْذِرُوْٓا اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاتَّقُوْنِ (16:2)۔ یہ خدا ملائکہ کو ''روح'' کے ساتھ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے نازل کرتا ہے تاکہ وہ اس کے ذریعے لوگوں کو آگاہ کریں۔ صاف بات یہ ہے کہ وہ اپنے بندوں کے اوپر ملائکہ کے ذریعے جو نازل کرتا تھا وہ وحی تھی۔ اسی طرح سے یہاں تو بات اور بھی واضح ہو گئی ہے۔ (42:52) دیکھیے' پیچھے سے یہ بات چلی آ رہی ہے کہ خدا انسانوں میں سے اپنے رسولوں کے ساتھ کلام کرتا تھا' وحی دیتا تھا' ان کو پیغام پہنچاتا تھا۔ اس کے کیا کیا طریقے تھے؟ کیا انداز تھا؟ میں اس آیت کو چھوڑتا ہوں' لمبی بات ہے۔ بات یوں ہے: وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا (42:52)۔ اس طرح سے ہم نے اے رسول! تیری طرف وحی کیا ہے اپنی روح کو' اپنے امر کے ذریعے سے۔ اگلی آیت میں ہے۔ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ (42:52)۔ تو تُو اے رسول! اس سے پہلے جانتا ہی نہیں تھا کہ کتاب کسے کہتے ہیں' ایمان کیا ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں مَیں نے کئی دفعہ بتایا ہے کہ جس کو وحی ملتی تھی اس میں اس کی اپنی سعی و عمل' کسب و ہنر' محنت و کاوش' فکر و خیال' کا کوئی دخل نہیں ہوتا تھا۔ ❷ خالص علمِ خداوندی تھا جو اس کے اوپر نازل ہوتا تھا۔ تو میں عرض یہ کر رہا تھا کہ یہاں روح کے معنی وحی ہیں۔ تو اب اس آیت میں بات ہو رہی ہے کہ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ روح کیا ہے؟ تُو قرآن کی بات کر رہا ہے' سیدھے راستے کی بات کر رہا ہے' تو وحی کی بات ہے کہ ''یہ جو مجھے وحی کے ذریعے سے ملا ہے'' تو وہ وحی کے متعلق پوچھتے ہیں۔

وحی کی ماہیت اور کیفیت وغیرہ کو غیر از نبی جان ہی نہیں سکتا

اب دو باتیں ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ وحی کیا ہوتی تھی؟ کیسے ملتی تھی؟ کیفیت کیا تھی؟ ملنے کا طریقہ کیا تھا؟ قرآن نے کہا ہے کہ اس ساری ماہیتِ وحی کی باتوں کا تعلق عالمِ امر سے ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ قرآن نے دو عالم کا ذکر کیا ہے۔ ایک تو خدا کا وہ عالمِ امر ہے' جہاں یہ ساری چیزیں اپنی Direction کے مطابق' اس کے پروگرام کے مطابق' اس کی پلاننگ کے مطابق' طے پاتی ہیں۔ ہمیں اس کا کچھ علم نہیں ہے: یہ کیسے ہوتا ہے' کس طرح سے ہوتا ہے۔ لیکن اس کے بعد دوسرا عالمِ خلق ہے۔ یہ ہماری دنیا ہے' جس میں اس کے فیصلے

---

❶ یہ کتاب ۳ ضخیم جلدوں میں چھپ کر منظرِ عام پر آ چکی ہے۔

❷ اس نکتے کی مزید وضاحت کے لیے دیکھیے: مطالب الفرقان فی دروس القرآن سورۃ النحل' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ گلبرگ لاہور 2003ء ص۔ 4 اور 5' عنوان: روح کا قرآنی مفہوم' قرآن میں انسان کے لیے روح کے بجائے نفس کا لفظ آیا ہے اور قرآن میں روح کا لفظ وحی کے لیے ہے۔

آتے ہیں اور یہاں آنے کے بعد ہم ہر چیز کو سمجھتے ہیں کیونکہ عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآ كُلَّهَا (2:31)۔آدم میں صلاحیت دیدی گئی ہے کہ یہ ان کا علم حاصل کر لے۔ وحی کی ماہیت یا کیفیت کیا ہے؟ کیسے ہوتا ہے؟ یہ کس طرح آتی ہے؟ کہا کہ اس کا تعلق عالمِ امر سے ہے اور وہ عالمِ امر یہ ہے کہ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا (17:85)۔اس کے متعلق تو تمہیں علم نہیں اور یہ جو تمہارا' انسانوں کا اپنا بھی علم ہے' اس میں وحی کی ضرورت اس لیے پیش آ جاتی ہے کہ اس کائنات کے متعلق تمہارا علم کتنا ہی وسیع ہو' یہ مستقل اقدار' یہ اصولِ ہدایت' وہ چیزیں ہیں' جن میں انسانی علم بہت ہی قلیل ہے۔ یہ خود ان چیزوں کو نہ وضع کر سکتا ہے' نہ خود ان کا کہیں سے انکشاف کر سکتا ہے۔ یہ اقدار تو خالص وحی کے ذریعے سے مل سکتی ہیں۔ یہ جو تمہارے علم کا کم ہونا ہے' اس کی وجہ سے وحی کی ضرورت پڑتی ہے۔ تو یہ جو ہمارے ہاں آیت ہے۔ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰىهَا (91:8)۔اس میں عجیب عجیب غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں کہ انسان کے اندر نیکی اور بدی کا علم رکھ دیا ہے۔ اگر یہ بات ہے تو پھر یہ رسول' یہ نبی' یہ وحی' یہ ساری چیزیں' یہ سب سلسلہ کاہے کے لیے ہے۔ وہ ٹھیک ہے کہ چوزے کے اندر یہ رکھ دیا ہے کہ خشکی کے اندر رہے گا' تو محفوظ رہے گا' پانی میں جائے گا تو ڈوب جائے گا' دانہ دنکا کھاؤ گوشت کی طرف نظر نہ اٹھاؤ' چیل کا سایہ پڑے تو ماں کے نیچے گھس جاؤ۔ بلی میاؤں کرے تو بھاگ جاؤ' یہ نہ تو کسی استاد نے اس کو پڑھایا' نہ اس کی طرف کوئی وحی ہوئی' نہ کوئی رسول آیا ہے۔ یہ اس کے اندر کیا ہے' انسان کے اندر یہ سب چیزیں ہوتیں تو وحی کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ اس کے اندر نہیں ہیں اور یہ جو انسان کے اندر کی کمی ہے کہ یہ چیزیں اس میں نہیں ہیں' ان کا علم نہیں مل سکتا۔ تو یہ ہے وہ کمی جس کو پورا کرنے کے لیے وحی کی ضرورت پڑتی ہے۔

ذکر کچھ عالمِ امر اور عالمِ خلق کا

یہ چیزیں وحی کے ذریعے سے ملیں گی' تو وحی کیا ہے؟ اس کی نوعیت کیا ہے؟ کیفیت کیا ہے؟ ماہیت کیا ہے؟ ملتی کیسے ہے؟ نازل کیسے ہوتی ہے؟ کہا کہ ان امور کا تعلق عالمِ امر سے ہے۔ تم یہ نہیں سمجھ سکتے لیکن عالمِ امر میں سے خدا کی وہ تعلیم جب الفاظ اور حروف کی شکل کے اندر آ گئی' تو یہ عالمِ خلق کی چیز ہو گئی' محسوسات کی بات ہو گئی اور اب یہ ہماری سمجھ میں آ سکتی ہے یعنی وحی کی تعلیم تو ہماری سمجھ میں آ سکتی ہے' وحی ہوتی کیا تھی؟ ملتی کیسے تھی؟ یہ نبی کے سوا کسی اور کی سمجھ میں آ ہی نہیں سکتی' اور نہ ہی نبی اسے کسی دوسرے کو سمجھا سکتا تھا کیونکہ یہ اس کی خالصتاً انفرادی چیز تھی۔ اب باقی رہا یہ کہ وہ وحی تو اس لیے دی جاتی ہے کہ اس میں نبی کے اپنے فکر اور خیال کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اگلی بات یہ رہی کہ جو وحی ہم نے اس کو دی ہے' وہ محفوظ ہے' وہ تم تک آج قرآنِ کریم کے ذریعے پہنچ رہی ہے۔

قرآن حکیم کا اعجاز یہ ہے کہ اس کی مثال کوئی نہیں لا سکتا

کہا: سیدھی سی بات تھی۔ وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهٖ عَلَيْنَا وَكِيْلًا (17:86)۔اور میں سمجھتا ہوں کہ اسکے لیے یہ ایک ہی آیت کافی ہے جبکہ قرآنِ کریم کی حفاظت کے لیے آیتیں تو بہت سی ہیں۔ اس کی

حفاظت کے لیے یہ بھی ایک بڑی سند ہے۔ کہا: یہ چیز کہ یہ قرآن تیرا اپنا پیدا کردہ نہیں ہے' اس کی تو سب سے بڑی دلیل ہی یہ ہے کہ اگر ہم چاہتے تو اس قرآن میں سے واپس لے جاتے' تو نہ تُو کہیں سے اس کو واپس لا سکتا تھا' نہ ہی کوئی دوسرا ایسا ہو سکتا تھا جو اس سلسلہ میں تیری کوئی مدد کرتا۔ اس کا سوال ہی نہیں ہے۔ آگے بتایا ہے کہ کیوں ایسا نہیں ہو سکتا تھا؟ کہا کہ اگر ہم یہ چاہتے تو ایسا ہوتا مگر ہم نے ایسا چاہا ہی نہیں ہے۔ قرآن دیا اور اس کے بعد ہم نے یہ چاہا ہی نہیں کہ اس میں سے کچھ حصہ کم ہو جائے' کچھ تُو بھول جائے' یہ ناقص رہ جائے' یہ غیر محفوظ رہ جائے۔ اس کا تو سوال ہی نہیں۔ ہم نے اسے نازل کیا۔ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (15:9)۔ ہم نے اس کی حفاظت کا خود ذمہ لیا ہے تو ہم نے اس کو محفوظ کر دیا ہے کہ اس میں سے کوئی ایک حرف تک بھی ایسا نہیں ہے کہ جو غیر محفوظ ہو جائے' منسوخ ہو جائے' مٹ جائے' نہ رہے اور یہ تمہیں جو ملا ہے تمہاری اپنی سعی و عمل کی وجہ سے نہیں ہے۔

مقامِ نبوت انسانیت میں عظمتوں کا بلند ترین مقام ہے

اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ اِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ عَلَيْكَ كَبِيْرًا (17:87)۔ یہ تو اس کے فضل و رحمت سے تمہیں عطا ہوا ہے۔ یہ بہت بڑا فضل ہے جس پر یہ ہو جائے۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ بہت بڑا مقام ہے اور پھر مقام بھی نبوت کا اور نبوت بھی وہ جو آخری نبوت ہے۔ اس مقام کا تو پوچھنا ہی کیا ہے! اس میں تو انسانی تصور عاجز آ جاتا ہے۔ مقامِ نبوت اور نبوتِ محمدیؐ کا مقام عزیزانِ من! اس کی عظمتوں کو دیکھ کر انسانی تصور کانپنے لگ جاتا ہے۔ نبی کا تو مقام ہی نہیں سمجھ میں آتا۔ جیسے میں نے عرض کیا ہے کہ وہ نبی بھی قیامت تک کے لیے رہنے والا نبی تھا۔ اِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ عَلَيْكَ كَبِيْرًا (17:87)۔ باقی رہا یہ کہ اگر اس میں سے کوئی چیز نہ رہتی تو؟ ہمارے ہاں امتحانوں میں Fill in the blanks یا Fill in the gaps کا پرچہ آیا کرتا ہے۔ تو اس کے اندر خود ہی گیپ' Blanks' رکھ لیتے ہیں اور ان لڑکوں سے جن کا امتحان لینا ہوتا ہے' کہتے ہیں کہ ان کو پُر کرو۔ کہا: اگر قرآن کی صورت یہ ہو جاتی کہ اس میں کہیں Gaps آ جاتے تو پھر' تیرے متعلق ہم نے یہ کہہ دیا ہے کہ تجھے تو اس سے پہلے پتہ ہی نہیں تھا کہ ایمان کسے کہتے ہیں' کتاب کیا ہوتی ہے' تیرے بس کی تو یہ بات نہیں تھی۔

یہ چیلنج تو ہر دور کی ہر نسل کے لیے ہے

باقی عزیزانِ من! جہاں تک دنیا بھر کے اربابِ دانش و بینش کا تعلق ہے تو اس کے لیے وہ آیت بار بار دہرائی گئی۔ قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا (17:88)۔ کہا کہ ساری دنیا کے دانشوروں کو اکٹھا کر کے آواز دے لو اور ان سے کہو کہ "لاؤ اس قرآن کی مثل۔" سارے مل کے بھی نہیں لا سکیں گے۔ تو اس میں خدا نکردہ کہیں گیپ آ جاتا تو اس گیپ کی فلنگ کرنے والا کون تھا۔ نبی نہیں کر سکتا تھا کہ وہ نبوت سے پہلے خود اس کو

کچھ پتہ نہیں ہوتا تھا۔ ساری دنیا کے اہلِ فکر و اہلِ دانش و بینش کے لیے چیلنج ہے' عزیزانِ من! اور جیسا میں نے اس سے پہلے بھی کئی دفعہ کہا ہے کہ یہ چیلنج کچھ یونہی نہیں ہے۔ یہ تو بڑی عظیم چیز ہے۔ حقیقت میں یہ مذاق نہیں ہے کہ تیئس برس تو نبی اکرم ﷺ کی زندگی میں یہ عرب جیسی وہ قوم' وہ قریش' جنہوں نے پہلے تیرہ برس مکہ میں اتنی مخالفت کی' اس کے بعد سات برس تک مسلسل لڑائیاں لڑتے رہے' جنگ کرتے رہے' کتنا اپنا نقصان کرایا' شکست کھائی' مکہ ہاتھ سے گیا' وہ ساری عظمتیں ضائع کیں۔ چیلنج تو اتنا ہی تھا کہ قرآن نے کہا تھا: ''اس کی آیت کی مثل بنا کے بتادو۔''

آج تک کسی نے قرآن کا یہ چیلنج قبول کیوں نہیں کیا؟

عربوں کی زبان کی کیفیت یہ تھی۔ میں جو کہہ رہا ہوں' اسے تو چھوڑ دیجیے۔ لفظِ عربی کے معنی ہی کچھ یوں بیان ہوتے ہیں۔ ان کا نام ہی عرب اس لیے ہے کہ وہ اپنے آپ کو سب سے زیادہ فصیح البیان کہتے تھے اور باقی ساری دنیا کو عجمی کہتے تھے' جس کے معنی ''گونگے'' ہیں۔ ان کو گونگے کہتے تھے' اپنے آپ کو فصیح البیان۔ ان فصیح البیان لوگوں سے یہ چیلنج دیا جا رہا ہے کہ بابا! یہ ٹکراؤ' یہ تصادم' مخاصمت' یہ جنگیں یہ لڑائیاں' کاہے کے لیے ہیں؟ قرآن کی آیت کی مانند' ایک آیت کی مثل' بنا کے لے آؤ۔ بناؤ تو ہم سمجھیں گے کہ ہم نے شکست کھائی' ہم جھوٹے۔ یہ ان کے لیے کتنا آسان تھا' تو آپ کیا سمجھتے ہیں کہ انہوں نے یہ سن لیا ہوگا اور چپکے سے بیٹھ گئے ہونگے' انہوں نے کچھ نہیں کیا ہوگا۔ جنہوں نے جانیں تک دیدیں' مال تک لٹا دیئے' بیویاں تک ان کی چلی گئیں' گھر بار لٹ گیا' حکومت چلی گئی' تولیتِ کعبہ چلی گئی؛ تو انہوں نے کبھی بیٹھ کے سوچا ہی نہ ہوگا کہ صاحب! پورا قرآن نہیں یہ تو ایک آیت کہہ رہا ہے۔ ایک سورۃ کہہ رہا ہے' چند آیتیں کہہ رہا ہے۔ آؤ تو سہی۔ یہ نہیں کہ کہیں میدان گرم ہوا ہو' وہاں شکست کھائی ہو۔ وہ سامنے آئے ہی نہیں' تو یہ یونہی آیتیں نہیں ہیں۔ اور پھر اس چودہ سو سال کے عرصہ میں مسلمانوں اور اسلام کی دشمن قوتوں نے کیا کچھ نہیں کیا۔

آپ کو یاد ہے کہ میں نے کہا تھا کہ اگر آپ ایک صلیبی جنگیں لے لیجیے۔ سارے یورپ کی ساری عیسائی سلطنتیں تین سو سال تک مسلمانوں کے ساتھ لڑتی آئی ہیں۔ کیا ضرورت تھی! ان کے ہاں عربی کے بڑے بڑے فاضل' ان کے لکھے ہوئے عربی کے بہترین لغت تھے۔ عیسائی' عربی والے عیسائیوں کی آبادیاں' عربوں کے اندر موجود تھیں۔ یہ سارا مشرقِ وسطیٰ ان عیسائیوں سے اٹا پڑا ہے۔ ان کے اندر عربی کے اتنے بڑے بڑے ادیب ہیں' عربی ادب کی' ان کی کتابیں سند ہیں' یہ لڑائیاں جو وہ چودہ سو سال تک لڑتے رہے' ان میں سے کسی نے اتنا نہیں کیا کہ چلو بھئی! اس قرآن کی ایک مثل اس کا چیلنج ہے' چلو ان کو کہیں سے بنا کے دیدیں کہ لو بھئی! تو یہ نہیں ہے کہ کسی نے یہ کیا ہے اور فیل ہو گئے۔ کسی نے چیلنج ہی قبول نہیں کیا ہے۔ اسے معجزہ کہتے ہیں عزیزانِ من! انسان عاجز آجائے' سامنے آنے کی جرأت نہ کرے۔ یہ ہے قرآن کا اعجاز اور پھر یہ ہے اس کا انداز!

Marfat.com

قرآن کا اندازِ بیان تصریفِ آیات ہے

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِیْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ (17:89)۔اس کا انداز یہ ہے کہ ہم لوٹا لوٹا کے بات کو لاتے ہیں' پھرا پھرا کے بات کو لاتے ہیں' تصریفِ آیات سے سمجھاتے ہیں' بار بار یوں کرتے ہیں' ہر بات سمجھاتے ہیں' ہم نے اس قرآن میں ہر بات اس طرح سے سمجھائی ہے۔ نہایت واضح قرآن' ایسا شفاء و رحمت والا' اتنا واضح' اس قدر بے مثل و بے نظیر!! لیکن سب سے زیادہ مخالفت کیوں؟

سب سے پہلے اور سب سے زیادہ مخالفت کرنے والے

اس مخالفت کے باوجود فَاَبٰۤی اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا (17:89)۔ کیفیت یہ ہے کہ وہ لوگ بھی ہیں' جن کی اس کے خلاف انکار اور نفرت بڑھتی چلی جاتی ہے۔ یہ کونسے لوگ تھے؟ سب سے پہلے یہ وہی قریش تھے۔ کیا ہو رہا تھا؟ وہی بات کہ ان کی مفاد پرستیوں پر اس قرآن سے زد پڑتی تھی۔ یہ نہیں ہے کہ جانتے نہیں اور اس کے بعد بھی اس چودہ سو سال کے اندر باطل کا نظام جہاں بھی ہے' خواہ سیاست ہو' معیشت ہو' مذہب کی دنیا ہو' جانتے ہیں کہ قرآن کیا کہتا ہے۔ عزیزانِ من! اپنی مفاد پرستیاں ہیں' جو اس طرف آنے نہیں دیتیں۔ فَاَبٰۤی اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا (17:89)۔ کہتا ہے ہم تو قرآن کی یہ تہدید پیش کر رہے ہیں کہ یہ اس کا مقام ہے اس لیے لاؤ اس کے مقابلے میں۔ مگر یہ ہیں کہ اس کے باوجود' ضد اور تعصب کی بنا پر' بلا سوچے سمجھے' اس سے انکار کیے چلے جاتے ہیں۔

غور و فکر کرنے کی بجائے کسی معجزے کا مطالبہ

یہ بار بار کیا کہتے ہیں: کوئی معجزہ دکھاؤ۔ دراصل یہ ان کی جہالت تھی۔ ذہنِ انسانی کا طفلانہ پن تھا۔ معمول کے خلاف ذرا سی چیز بچوں کے سامنے لا کے رکھیے۔ دیکھیے کیسے لپک کر اس کی طرف جاتے ہیں۔ یہ سارا قرآن' یہ ساری تعلیم' یہ مہارت' یہ حقائق اور یہ سارا کچھ ایک طرف اور اس کے برعکس وہ سامنے' وہاں ٹینکی کے نیچے' ایک پرانے لمبے بالوں والا کھڑا ہو' پرانے اس لیے کہا کہ اب تو ہمارے ہاں سارے ''مردِ قلندر'' ہیں' اللہ کا فضل ہے' سب قلندر ہیں۔ ''اور اوناں دی قلندری نے آپنے آپنے ناں وکھرے وکھرے رکھ لئے ہوئے نیں' گل ایہوئی ہیگی اے'' [1] چوغا پہنے ہوئے' یہ کہے کہ آؤ' وہ دیکھو میں اس سے آگ نکالتا ہوں' بالوں کو نچوڑتا ہوں' دودھ نکلتا ہے' یہ سارے قرآن سننے والوں کا جمگھٹا' اس کے گرد کھڑا ہو جائے گا۔ انسانی ذہن کا طفلانہ پن تو ابھی تک ایسا ہے۔ شکر فروش اسی لیے اس کے سامنے کامیاب ہو جاتے ہیں۔ ہر ڈگڈگی بجانے والا کچھ نہ کچھ اپنے گرد جمع کر لیتا ہے۔ جناب! کرامات دکھاتا ہے' نبوت کا دعویٰ ہوتا ہے اور اس دعویٰ کا ثبوت یہ ہے۔ کہ ''میں نے کہا تھا زلزلہ آئے گا' وہ آ گیا'' کیا کبھی زلزلے نہیں آتے؟ دنیا کے کسی نہ کسی کونے میں زلزلے آتے ہیں۔ دعا یہ مانگے کہ الٰہی عمرِ خضر دراز ہو۔ ادویات بہتر ہوئیں' خطرناک بیماریوں کا علاج ممکن ہوا' عمریں پہلے کی

---

[1] اور ان کی قلندری نے اپنے اپنے الگ الگ نام رکھ لیے ہیں۔ بات یہی ہے۔

Marfat.com

نسبت بڑی ہوگئیں۔لیکن قرآن کی مثل لانے کا چیلنج آج بھی قائم ودائم ہے۔کہا: ہم یہ کہہ رہے ہیں کہ آؤ' قرآن کی مثل' ایک سورۃ' ایک آیت بنا کے لاؤ۔ یہ کتنا بڑا دعویٰ ہے۔لیکن یہ کہتے ہیں کہ نہیں' ہم اس طرح ایمان نہیں لائیں گے۔بھئی! تو پھر بتاؤ' کیسے ایمان لاؤ گے؟ وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَکَ حَتّٰی تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ یَنْۢبُوْعًا(17:90)۔زمین کو یہ حکم دو کہ پانی کا ایک چشمہ جاری ہو جائے۔اچھا جی کہا گیا! کہا: پانی کا چشمہ ہی نہیں اَوْ تَکُوْنَ لَکَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِیْلٍ وَّعِنَبٍ (17:91)۔بلکہ یہاں لہلہاتے باغ لگ جائیں۔انہیں انگور لگے ہوئے ہوں۔یہاں پہ کیلے اُگے ہوئے ہوں۔صاحب! یوں حکم دو اور یہ سب چیزیں لگ جائیں۔ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِیْرًا(17:91)۔ باغ بھی لگ جائیں اور ان کے نیچے سے پانی کی نالیاں بھی خود بخود تمہارے کہنے سے بہنے لگ جائیں۔اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ کَمَا زَعَمْتَ عَلَیْنَا کِسَفًا (17:92)۔ پھر یہ تم روز ڈراتے رہتے ہو کہ یہ ایک ناگہانی آفت آئے گی' یہ عذاب آئے گا' تمہارے اوپر تباہی آئے گی۔پھر ہم اپنے اوپر آسمان کا کوئی ٹکڑا گرتا دیکھیں کہ یہ کیسے تباہی آتی ہے۔اَوْ تَاْتِیَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِکَةِ قَبِیْلًا (17:92)۔نہیں' خدا اور اس کے فرشتوں کو ہمارے سامنے لا کے کھڑا کرو' تب ہم ایمان لائیں گے۔ سنیے جو ان کی شرائطِ ایمان ہیں۔اَوْ یَکُوْنَ لَکَ بَیْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ(17:93)۔نہیں' بھئی! ایک اور بولا: اتنی بات نہیں ہے جی! یہ کھڑے کھڑے اس میدان میں تمہارے لیے ایک مکان بن جائے' مکان سونے کا ہونا چاہیے۔

آپ کو ایک کتاب لانے کے لیے آسمان پر چڑھنا اور واپس آنا ہوگا

دوسرا بولا: نہیں اَوْ تَرْقٰی فِی السَّمَآءِ(17:93)۔ہمارے سامنے' ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے تُو آسمان پہ چڑھ جائے۔مگر ہاں' صرف آسمان کے اوپر ہی نہ چڑھ جائے کیونکہ محض اتنی سی بات سے ہم تجھ پر ایمان نہیں لائیں گے' پھر کہا: صرف اتنے سے کام نہیں چلے گا۔البتہ ہاں! تو اس طرح سے چڑھ جا: وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِیِّکَ حَتّٰی تُنَزِّلَ عَلَیْنَا کِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ (17:93)۔اور وہاں سے جب تُو واپس آئے تو تمہارے پاس ایک کتاب ہو' لیجیے صاحب! وہ کتاب ابھی ابھی اللہ میاں نے چھاپی ہے۔دیکھتے نہیں ہو' ابھی تو اس کی سیاہی بھی خشک نہیں ہوئی ہے۔''اوچھاجیا پے گیا سی اوہدے سر دے اُتے' ہن تک سام کے رکھیا ہویا اے''[1] تماشا ہے' یہ اسے پڑھ کر دیکھ لیں کہ اسے واقعی خدا نے لکھا ہے۔اور یہ کہیں کہ میں اسے دستخط کروانے کے لیے لے گیا تھا۔ان کے ہاں یہ موجود ہے کہ اس نے جو اس کے اوپر دستخط کیے وہ سرخ سیاہی سے تھے' انہوں نے سرخ سیاہی سے لکھا ہوا ہے' یہ کیفیت ہے سرخ سیاہی کی۔یہ الہامی زبان ہے تو انہوں نے اس پر لکھا ہے کہ یہ چھڑکا ہوا قلم ہے۔ہاں یہ جو میرے ساتھ پٹواری صاحب تھے' ان کے کُرتے (Shirt) کے اوپر اس سرخ سیاہی کے چھینٹے پڑ گئے اور صبح وہ کُرتہ دکھاتے پھر رہے تھے۔اللہ میاں نے وہ سرخ سیاہی کا قلم رکھا ہوا ہے۔''او پہلی جماعت دا منڈا

---

[1] اس کے سر پہ ذرا چھینٹا سا پڑ گیا تھا' ابھی تک اسے سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔

Marfat.com

ہیگا اوتے ڈوبالے کے چھڑکے تے ماسٹر طمانچہ ماردا ہیگا اے' ساری تختی خراب کرتی۔'' ❶ یہ قلم! وہ سرخ سیاہی اور اس پر طرفہ تماشہ یہ کہ میرا کرتہ اور پھر قلم جھڑکنے سے اس پر سرخ نشان۔ اس افسانے کو کیا کہیے عزیزان من! دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں! ❷

مذہب کی تعلیم' اس کے افسانے' قوم کی علمی سطح اور سوچ

عزیزانِ من! آپ کیا باتیں سنتے ہیں۔ ان کا تو کوئی دوش ❸ نہیں ہے۔ قوم ہی یہاں تک پہنچ گئی ہے۔ انہیں بھی اس قوم کے اندر سے' اپنے متبعین (Followers) مل جاتے ہیں۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ قوم کی ذہنی سطح کیا ہے۔ آپ کے ہاں اس مذہب نے' ان افسانوں نے' مشاکلت کتنی تنگ کر دی ہے۔ اُنہیں بھی اپنے متبعین مل جاتے ہیں' اِنہیں بھی ماننے والے مل جاتے ہیں۔ عزیزانِ من! اس پہ دنیا ہنس دیتی ہے۔ خیر' بات آگے لے کر چلتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ نہیں صاحب! اوپر سے لکھی لکھائی کتاب لانی چاہیے' یوں ماننے کی بات ہے۔ اب اس میں دو باتیں ہو گئیں: تُو معجزے دکھا' اگر تُو نہیں دکھاتا تُو بہر حال تو کہتا ہے کہ خدا کی طرف سے یہ تباہی آئے گی' تو پھر اپنے خدا سے کہو کہ دکھاؤ' وہ تباہی کہاں ہے۔

ذاتِ خداوندی اس طفلانہ پن سے بہت بلند ہے

عزیزانِ من! یہ سارے دعاوی ایک طرف رہے۔ چار لفظ ہیں۔ کہا: خدا کی بات کہتے ہو تو سنو: قُلْ سُبْحَانَ رَبِّیْ (17:93)۔ میرا رب تمہارے ان طفلانہ پن کے تصورات سے بہت بلند ہے' بہت آگے ہے' بہت دور ہے۔ سُبْحٰنَ اللّٰہِ عَمَّا یَصِفُوْنَ (23:93)۔ اس کے متعلق جو کچھ بھی تم اپنی فکر سے تصور قائم کرتے ہو' یہ اس سے بہت بلند اور بالا ہے۔

برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم

خدا تمہاری ان بچپن کی باتوں سے بہت بلند ہے کہ تمہیں یہ شعبدے دکھاتا پھرے تا کہ تم ایمان لے آؤ۔ اب جہاں تک رسولؐ خدا کی ذات کا تعلق ہے تو عزیزانِ من! سنیے: هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا (17:93)۔ میں تو تمہارے جیسا ایک آدمی ہوں' ایک انسان ہوں' فرق صرف اتنا ہے کہ خدا ایک پیغام دیتا ہے' تم تک پہنچا دیتا ہوں۔ لہٰذا یہ کیا سوال ہے کہ یہ کر کے دکھاؤ' وہ کر کے لاؤ۔ خدا تو اس بستی میں آتا نہیں ہے۔ میں تمہارے جیسا ایک انسان ہوں لیکن ایک ہی بات ہے جو اس میں کہی گئی ہے۔ وہ یہ ہے کہ تمہارے جیسا انسان ہوں لیکن فرق یہ ہے کہ میں رسول ہوں۔ بات پھر وہیں آ گئی کہ میں جو پیغام لایا ہوں' کم بختو! اس پہ غور کرو۔ کیا بات ہے جو وہ (اقبال (1877-1938) ایک مسلم فلاسفر) کہہ جاتا ہے! ''قلندرِ ہم کرامات جہاں بین است'' اس کا خوب انداز ہے۔ ہم قلندر ہیں'

---

❶ گویا کہ وہ پہلی جماعت کا بچہ ہے۔ وہ سیاہی میں قلم ڈبو کر چھڑکے تو ماسٹر صاحب اس کے منہ پہ طمانچہ (تھپڑ) دے ماریں' کہیں: ارے کم بخت! تُو نے تو ساری تختی خراب کر دی۔ یا للعجب!

❷ حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں (غالب)

❸ قصور' Fault۔

Marfat.com

یہ جو سمجھنے والے نکات اٹھائیں گے کہ یہاں جمع کا صیغہ آیا ہے' قلندر کہہ کے قلندر ہم اپنے آپ کو مستغنی کہتا ہے:

قلندرِ یم و کراماتِ ماجہاں بینی است
زمانگاہ طلب ' کیمیاچہ می جوئی

کہا: مجھ سے مانگنا ہے' ہم سے مانگنا ہے' تم مانگنا چاہتے ہو تو وہ نگاہ مانگو جو تمہیں سب کچھ دکھائے۔ او ہم سے تیلیاں مانگتے ہو۔ کیا بدبختی ہے۔ کہا کہ میں تو ایک بشر ہوں' رسول ہوں۔ یاد رکھو! پیغام لایا ہوں' پیغام کی بات کرو۔ اور پیغام کی بات میں نے تمہیں بتادی ہے: جاؤ' اس پیغام کی ایک آیت کی مثل لاؤ' پھر پتہ چل جائے کہ معجزہ کسے کہتے ہیں۔ میرا یہ معجزہ تمہارے بھی سامنے ہے اور قیامت تک کے لیے انسانوں کے بھی سامنے رہے گا۔

نبی اکرم ﷺ کے دو معجزے

عزیزانِ من! قیامت تک اربابِ دانش وبینش کے سامنے یہ معجزہ ہے: ''جاؤ' اس پیغام کی ایک آیت کی مثل ہی لے آؤ۔'' اس کے سامنے سب اربابِ دانش وبینش عاجز ہیں۔ عزیزانِ من! اسے معجزہ کہتے ہیں۔ دو ہی تو معجزے تھے جو حضور ﷺ نے دکھائے۔ پہلی بات وہ کہی کہ جب انہوں نے اِن کی مخالفت کی ہے کہ آپ نے یہ کیسے دعویٰ رسالت کر دیا؟ اس کے لیے کوئی محسوس چیز تو ہے نہیں' جو آپ پیش کر دیتے۔ کوئی کرامت نہیں' کوئی معجزہ نہیں' کوئی شعبدہ نہیں۔ کیا کہتے ہو؟ عزیزانِ من! پہلا معجزہ علی الاعلان یہ پیش کیا: فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهِ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ (10:16)۔ میں کہیں باہر سے نہیں آ گیا۔ اجنبی نہیں ہوں کہ تم میرے متعلق کچھ جانو نہیں۔ کوئی سیلانی' کوئی جوگی نہیں ہوں کہ تمہیں میرے ماضی کا پتہ نہ ہو۔ میں نے اس سے پیشتر تمہارے اندر اپنی ساری عمر بسر کی ہے۔ خود ایمان سے کہو کہ ایسی عمر ایک سچے کی عمر ہوتی ہے یا ایک جھوٹے کی عمر ہوتی ہے۔ عزیزانِ من! مخالفین کے بھرے مجمعے کے اندر کھڑے ہو کے کہا' کسی میں انگشت نمائی کی جرأت نہیں ہوئی کہ ہاں تمہاری زندگی میں ہم نے یہ بات یوں دیکھی ہے۔ خاموش ہو کے' عاجز ہو کے' چلے گئے۔ یہ پہلا معجزہ سیرتِ نبوی ﷺ کا ہے۔ دوسرا معجزہ قیامت تک کے لیے ''پیغامِ نبوی'' ہے' جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو ملا۔ بس یہ ہیں وہ معجزے۔ آج بھی کوئی معجزہ دکھانا چاہتا ہے تو معجزہ یہ ہے کہ اپنی زندگی سامنے پیش کرے۔ اپنا ''ماضی'' اپنا Past سامنے پیش کرے۔ دعویٰ کے بعد کی زندگی نہیں بلکہ اپنے دعوے سے پہلے کی زندگی پیش کرے۔ دعوے کے بعد تو آدمی بڑا محتاط ہو جاتا ہے' سب حضرت جی بن جاتے ہیں۔ اس سے پہلے کی زندگی مِنْ قَبْلِهِ (10:16) کو پیش کرے کہ وہ کیسی ہے۔ اور اِسے ہی آپؐ نے پیش کیا۔

عزیزانِ من! ہم سورۃ بنی اسرائیل کی آیت 93 تک آ گئے۔ 94 ویں آیت اگلے درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۖ إِنَّكَ أَنتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ.

Marfat.com

سولہواں باب: **سورة بنی اسرائیل** (آیات 94 تا اختتام)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰٓى اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ﴿۹۴﴾
قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا ﴿۹۵﴾ قُلْ
كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًۢا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًۢا بَصِيْرًا ﴿۹۶﴾ وَمَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۚ وَ
مَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ اَوْلِيَاۗءَ مِنْ دُوْنِهٖ ۭ وَنَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَلٰي وُجُوْهِهِمْ عُمْيًا وَّبُكْمًا وَّصُمًّا ۭ
مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ كُلَّمَا خَبَتْ زِدْنٰهُمْ سَعِيْرًا ﴿۹۷﴾ ذٰلِكَ جَزَاۗؤُهُمْ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا وَقَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا
عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا ﴿۹۸﴾ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ
قَادِرٌ عَلٰٓي اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ وَجَعَلَ لَهُمْ اَجَلًا لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۭ فَاَبَى الظّٰلِمُوْنَ اِلَّا كُفُوْرًا ﴿۹۹﴾ قُلْ لَّوْ اَنْتُمْ
تَمْلِكُوْنَ خَزَاۗىِٕنَ رَحْمَةِ رَبِّيْٓ اِذًا لَّاَمْسَكْتُمْ خَشْيَةَ الْاِنْفَاقِ ۭ وَكَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا ﴿۱۰۰﴾ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰي
تِسْعَ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ فَسْـَٔـلْ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اِذْ جَاۗءَهُمْ فَقَالَ لَهٗ فِرْعَوْنُ اِنِّىْ لَاَظُنُّكَ يٰمُوْسٰى مَسْحُوْرًا ﴿۱۰۱﴾
قَالَ لَقَدْ عَلِمْتَ مَآ اَنْزَلَ هٰٓؤُلَاۗءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ بَصَاۗىِٕرَ ۚ وَاِنِّىْ لَاَظُنُّكَ يٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا ﴿۱۰۲﴾
فَاَرَادَ اَنْ يَّسْتَفِزَّهُمْ مِّنَ الْاَرْضِ فَاَغْرَقْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ جَمِيْعًا ﴿۱۰۳﴾ وَّقُلْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ لِبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ
اسْكُنُوا الْاَرْضَ فَاِذَا جَاۗءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ جِئْنَا بِكُمْ لَفِيْفًا ﴿۱۰۴﴾ وَبِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَبِالْحَقِّ نَزَلَ ۭ وَمَآ
اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ﴿۱۰۵﴾ وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَي النَّاسِ عَلٰي مُكْثٍ وَّنَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا ﴿۱۰۶﴾ قُلْ اٰمِنُوْا
بِهٖٓ اَوْ لَا تُؤْمِنُوْا ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖٓ اِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ يَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا ﴿۱۰۷﴾ وَّ
يَقُوْلُوْنَ سُبْحٰنَ رَبِّنَآ اِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا ﴿۱۰۸﴾ وَيَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ يَبْكُوْنَ وَيَزِيْدُهُمْ خُشُوْعًا ﴿۱۰۹﴾ السجدة
قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ۭ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَاۗءُ الْحُسْنٰى ۚ وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا
تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ﴿۱۱۰﴾ وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ
فِي الْمُلْكِ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلِيٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَكَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا ﴿۱۱۱﴾

عزیزانِ من! آج ستمبر 1975 کی 21 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ بنی اسرائیل کی آیت 94 سے ہو رہا ہے۔

Marfat.com

17:94 ۔ سابقہ آیات میں یہ بات سامنے آئی تھی کہ مخالفین کا نبی اکرمؐ سے مطالبہ یہ تھا کہ آپ ہمیں معجزات دکھایئے تو پھر ہم ایمان لائیں گے اور جواب یہ دیا گیا تھا کہ اگر تم یہ معجزے اللہ کی طرف سے مانگتے ہو تو وہ تمہارے اس طفلانہ پن سے بہت اونچا' بہت بلند و منزہ ہے۔ وہ تمہارے جذبات کی تسکین کے لیے اپنے قوانین میں تبدیلیاں نہیں کر سکتا اور اگر مجھ سے معجزے مانگتے ہو تو هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا (17:93) ۔ میں تو تمہارے جیسا ایک آدمی ہوں بس اتنی سی بات ہے کہ خدا کا ایک پیغام ہے' جو مجھے ملتا ہے' میں وہ تم تک پہنچا دیتا ہوں اور اس کے بعد تو میں تمہارے ہی جیسا ایک آدمی ہوں۔ اور اگلی آیت میں اسی کو دہرایا کہ وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰٓى اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا (17:94) ۔ یہ آج کی بات نہیں ہے' یہ شروع سے ایسے ہی ہوتا چلا آیا ہے کہ ہم لوگوں کے سامنے الھدٰی پیش کرتے ہیں' صحیح راستے کی طرف راہنمائی کا چارٹ پیش کرتے تھے کہ اس دوراہے (Cross-roads) سے اس طرف کو جاؤ جو تمہیں منزلِ مقصود کی طرف پہنچانے والا راستہ ہے' اور اس کے برعکس ادھر نہ جاؤ کیونکہ یہ غلط سمت کی طرف لے جائے گا۔ جبکہ ان راہ روؤں کا مطالبہ یہ ہوتا تھا کہ اگر تم کوئی شعبدہ دکھاؤ تو ہم مانیں گے کہ یہ راستہ صحیح ہے اور یہ غلط ہے۔ یہ ہے انسانی ذہن کا وہ طفلانہ پن جو ہمیشہ مانع رہا ہے' خواہ ان سے کتنی بھی عقل و فکر کی بات کیوں نہ کی جائے لیکن پھر بھی ان کا مطالبہ شعبدہ بازیوں کا ہی ہوتا ہے۔

مذہب انسان کو بہلاتا ہے جبکہ دین انسان کو ذمہ داریوں کا شعور بخشتا ہے

اصل تو یہ ہے عزیزانِ من! کہ قرآنِ کریم اس دور میں آیا تھا' جب انسانیت اپنے عہدِ شباب میں پہنچ رہی تھی۔ وہ اسے اس کے بچپن کے زمانے سے نکالنا چاہتا تھا۔ مذہب اور دین میں فرق ہی یہ ہے کہ مذہب میں بچوں کو بہلایا جاتا ہے' دین بالغ انسانوں کو ان کی ذمہ داریوں سے آگاہ کرتا ہے۔ یہ مذہب ہی ہے کہ ہر بات میں آپ پوچھیں گے کہ مولوی صاحب! میں کیا کروں؟ مولوی صاحب! یہ ہو گیا' فرمایئے کیا ہو گا؟ اب کس طرح سے ہو گا؟ سونا کیسے ہے؟ جاگنا کیسے ہے؟ بیٹھنا کیسے ہے؟ اٹھنا کیسے اور کھانا کیسے ہے؟ پینا کیسے ہے؟ بچہ یہی کچھ کرتا ہے' بالغ آدمی تو یہ کچھ نہیں کرتا۔ وہ تو ایک اصولی بات پوچھتا ہے کہ نئے راستے پہ جانا ہو تو پوچھ لیتا ہے کہ صاحب یہاں سے جاؤں تو کس سمت کو جاؤں اور یہ بتا دیا جاتا ہے کہ یہاں سے سیدھے جاؤ' نہر کا پل آئے گا' وہاں سے دائیں کو لوٹ جانا۔ بس اس کو الھدٰی کہتے ہیں۔ یہ باقی جتنی بھی چیزیں ہیں' سب بچپن کی ہیں۔ اب اس کے اوپر یہ ذمہ داری عائد ہو گی کہ اتنی سی بات جو اسے معلوم نہیں تھی' وہ بتا دی اور اس کے بعد اس پہ چھوڑ دیا کہ راستے میں اگر کوئی Unforeseen چیز آئے گی' غیر متوقع چیز آئے گی تو اس اصول کی روشنی میں خود فیصلہ کر لینا۔ اور یہی انسانیت کے بالغ ہونے کی شے ہے' علامت ہے۔ ختمِ نبوت کے یہی معنی ہیں کہ اب بتانے والا بھی کوئی انسان نہیں چاہیے۔ ٹائم ٹیبل آپ کے گھر کے اندر کھا ہوا ہوتا ہے۔ آپ نے یہ اپنے ساتھ سٹیشن ماسٹر بٹھا رکھا ہوتا ہے کہ

Marfat.com

صاحب! وہ شیخوپورہ کی گاڑی کتنے بجے جائے گی۔ یہ ہے جسے ختمِ نبوت کہتے ہیں۔ سو سال سے بحثیں چلی ہوئی ہیں کہ پوچھو انسان بالغ ہو گیا یا ابھی بچہ ہی ہے؟ اب انسانیت بالغ ہو گئی۔ ختمِ نبوت کے معنی یہی تو ہیں۔

انسان کے لیے پہلا انقلاب: انسان حیوان سے ممتاز ہے

قرآن جو انقلابات لایا ہے عزیزانِ من! یہ بڑا انقلاب ہے۔ پہلا انقلاب تو یہ تھا کہ اس نے انسانوں کو حیوانوں سے ممتاز کیا۔ حیوانوں کے اندر الہام موجود ہوتا ہے' ان کو غلط اور صحیح کی تمیز دی ہوئی ہوتی ہے۔ انسانوں میں یہ چیز نہیں ہوتی۔ انہیں یہ چیز باہر سے ملتی تھی۔ اسی کے لیے مشیت کے پروگرام نے انبیاء کرام کا سلسلہ شروع کیا تھا جو ہمارے آخری نبی حضرت محمد مصطفیٰ تک آ کر ختم ہو گیا۔

انسان کے لیے اگلا انقلاب: اس کی بلوغت کا اعلان

اس کے بعد دوسرا انقلابِ عظیم یہ ہے کہ انسان غلط اور صحیح کی تمیز کے لیے شخصیتوں پر انحصار کیے جاتا تھا' وحی اس کے سامنے ہوتی نہیں تھی جو اسے صحیح راستے پر چلائے۔ چنانچہ اس کے بعد صحیح راستے کا چارٹ اسے دیدیا اور انسان کو درمیان میں سے نکال دیا گیا۔ وہ اس لیے کیا کہ اب بچہ جوان ہو گیا ہے' جس بچے کو آج لے کے آپ انارکلی [1] میں جاتے ہیں' آپ بھی احتیاط برتتے ہیں' اس کا ہاتھ پکڑتے ہیں اور اگر کسی وقت انگلی چھوٹ جاتی ہے تو وہ لپک کے آپ کی انگلی پکڑ لیتا ہے تا کہ وہ کہیں اِدھر اُدھر نہ ہو جائے' وہی بچہ جب جوان ہو جائے تو آپ کبھی انارکلی میں اس کی انگلی پکڑ کے چلانے کی کوشش کیجیے' جھٹکا دیگا: ابا جی! شرم آتی ہے۔ کیا کر رہے ہیں؟ بیٹا! تم تو خود اسی طرح سے میری انگلی پکڑتے تھے۔ جی! وہ تو میں ''ایویں چھوٹا جیا بچا ہوندا سی'' [2]۔ روز یہ کہتے سنائی دیں گے: ابا جی! آپ مجھے ابھی تک بچہ ہی سمجھتے ہیں۔ یہ انسانیت کی توہین ہے کہ بالغ ہونے کے بعد بھی اس کو بچہ سمجھا جائے۔ اب یہ چیز انسان کے طفلانہ پن کی علامت ہے۔ عقل و فکر کی رو سے فیصلہ کرنے میں بڑی محنت اور کاوش کی ضرورت ہوتی ہے۔ بچے میں ایک تو اس کی استعداد نہیں ہوتی اور دوسری یہ ہے کہ ابھی اس میں Dependability ہوتی ہے' اس میں دوسرے کے اوپر یونہی سب کچھ ڈال دینا ہوتا ہے۔ یہ بڑی مزے کی چیز ہوتی ہے:

جو غم ملا' اسے غمِ جاناں بنا دیا

یہ مرضی مولا کی کیفیت ہوتی ہے۔ برہم ہو گئے' بیٹھے ہیں۔ کہتے ہیں کہ تو ہمارے لیے فیصلے کر۔ ''اینوں ہور کوئی کم ای نئیں ہیگا تہاڈے فیصلے او کرے'' [3] ''اپنے فیصلے آپ کرو۔'' یہ ذمہ داری کا قبول کرنا ہے جس سے انسان بھاگتا ہے۔ دورا ہے پہ کھڑا ہو کے غلط اور صحیح راستے

---

[1] لاہور پاکستان کا ایک پرانا مشہور بازار۔ [2] ابھی چھوٹا سا بچہ ہی ہوتا تھا۔

[3] گویا اسے کوئی دوسرا کام ہی نہیں ہے' وہی تمہارے فیصلے کرے۔ ارے او! اب اپنے فیصلے آپ کرو۔

Marfat.com

کا فیصلہ کرنا' بڑی ذمہ داری چاہتا ہے۔ یہ Sign post چاہتا ہے۔ یہ چیز کہ ایک راہرو کو ساتھ لے لیا جائے' جو اُسے یہاں سے وہاں تک لیے چلا جائے' دراصل دوسرے پہ ذمہ داری ڈالنا ہے۔ اب قرآن نے انسانیت کو اس دور میں داخل ہوتے دیکھ لیا کہ اب یہ ذمہ داریاں اٹھانے کے لائق ہو گیا ہے تو اس نے اس پر ذمہ داریاں ڈال دیں۔ زندگی کے راہنما اصول دے دیئے لیکن اس کی تفصیلات نہیں دیں۔ تفصیلات بچوں کے لیے چاہئیں' بالغ کے لیے نہیں چاہئیں۔

انسان کو بچوں کی سطح پر رکھنا مذہبی پیشوائیت کے فائدے میں ہے

یہ بیچارے ملا ذہنیت کے لوگ تو اس بات کو سمجھتے ہی نہیں ہیں۔ یہ ان کے فائدے میں ہے کہ ان کو بچہ رکھا جائے۔ وہ ہر بات میں انہی کے محتاج ہی رہیں۔ کہا: یہ چیز حائل ہوتی رہی' ہم الھدیٰ دیتے رہے' راستہ بتانے والے Sign post دیتے رہے' رہنمائی کا چارٹ دے کر آگاہ کرتے رہے لیکن یہ حضرتِ انسان کرامات مانگتا رہا۔ ہم اس کی عقل و فکر کو اپیل کرتے رہے مگر وہ اپنے جذبات کی تسکین چاہتا رہا۔

انسانوں کی بستی میں انسانوں کی سطح پر بات ہوتی ہے

وہ زندگی کی حقیقتوں کا اعلان پہ اعلان کرتا چلا جا رہا ہے لیکن اس کے باوجود یہ چیز مانع رہی ہے کہ یہ تو ہمارے ہی جیسا ایک انسان ہے اور یہ کہتا کچھ ہے۔ کہا: ان سے کہو: قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْأَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا (17:95)۔ ان کا اعتراض یہ ہے کہ یہ انسان ہمارے جیسا کیوں ہے؟ ارے تم انسان بستے ہو۔ انسانوں کے لیے بات کرنے والا انسان ہی چاہیے۔ اگر یہاں فرشتے بستے تو ہم کسی فرشتے کو رسول بنا کے بھیجتے۔ سیدھی سی بات ہے۔ بستے ہیں انسان' چاہتے یہ ہیں کہ رسول وہ آئے جو انسانوں جیسا نہ ہو' کوئی فرشتہ ہونا چاہیے۔ دیکھتے ہیں عزیزانِ من! کیا جوابات ملتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ پھر ہم دین کو مذہب کی سطح پر لائے ہیں تو کس قدر ہم نے اپنے آپ کو بچپن میں رکھا ہوا ہے اور کس قدر مطمئن ہیں۔ ہم وہاں سے نکلنا ہی نہیں چاہتے۔ قرآن قدم قدم پہ کہتا چلا جا رہا ہے کہ وہ معجزات والی بات چھوڑ دو۔ یہ کرامات کی کوئی چیز نہیں ہے۔ رسول اللہ کو کوئی معجزہ نہیں دیا گیا۔ آپ ہمارے ہاں کی یہ کتابیں اٹھا کے دیکھیے۔ بڑے فخر سے سارے رسولوں کے معجزے ایک طرف گنائے جاتے ہیں اور پھر رسول اللہؐ کے معجزے ان سے کم از کم دگنے گنائے جاتے ہیں۔ یہ سب ان کتب میں ہے۔ ایک ایک ہزار معجزہ بتانے والی کتابیں آپ کے ہاں موجود ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ یہاں انسان بستے ہیں۔ اسلیے انسان رسول آتا ہے۔ فرشتے بستے تو فرشتوں کو ہم رسول کر دیتے۔ تمہاری طرح کا انسان ہوگا جو کہتا ہے: اسے غور سے سنو' اور یہ سب کچھ کہہ دیا: غور و تدبر کی رو سے بات کا سمجھانا' ایک ایک شک کا ازالہ کرنا' ایک ایک اعتراض کا جواب عقل و فکر کی بناء پر دینا' یہ سب کچھ دے دیا۔ اور اس مقام پہ کہا کہ یہ سب کچھ میں کر بیٹھا اور

اس کے باوجود اگر تم نہیں مانتے ہو تو قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا بَيْنِىْ وَبَيْنَكُمْ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًا بَصِيْرًا (17:96)۔ تو اس کے بعد میں تم پہ داروغہ مقرر نہیں کیا گیا۔ میرا کام بتانا تھا' وہ میں نے بتا دیا۔ تمہیں سمجھانا تھا' سمجھا دیا۔ تمہیں تمہارے اعتراضات کا جواب دیا' تمہارے شکوک کا ازالہ کیا' سب کچھ کیا۔ اب اس کے باوجود اگر تم اسے نہیں مانتے' مخالفت پہ اترے ہوئے ہو تو پھر تمہارے اور میرے درمیان خدا نگران ہے۔ وہ اپنے بندوں کو جانتا ہے کہ کون کیا کرتا ہے۔ اس کے مطابق فیصلہ ہو جائے گا۔ میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنا چاہتا۔

مروجہ تراجم عقل و بصیرت کی ساری عمارت کو ڈھیر کر دیتے ہیں

وَمَنْ يَّهْدِاللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِهٖ وَنَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ عُمْيًا وَّبُكْمًا وَّصُمًّا مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ كُلَّمَا خَبَتْ زِدْنٰهُمْ سَعِيْرًا (17:97)۔ میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ اس قسم کی جتنی آیات آتی ہیں ان کا غلط ترجمہ ہمیں اس قدر غلط راستے پہ لیجاتا ہے کہ اس سے قرآن کی وہ ساری عمارت ڈھے جاتی ہے' جو اس نے عقل و بصیرت کی بنیادوں اور انسان کی اپنی ذمہ داری کو نبھانے کی بنیادوں پر استوار کی ہوئی ہوتی ہے۔ وہی ترجمہ ''کہ جسے اللہ ہدایت دے وہ ہدایت پہ ہوتا ہے' جسے وہ گمراہ کر دے وہ گمراہ رہتا ہے''۔ چل بھئی' تو یہ جو سارا کچھ ہے' کاہے کے لیے ہے؟ یہ سارے دلائل اور براہین اور یہ عقل و فکر' غور و تدبر' قرآن کی ہدایت' یہ سب کچھ ان پہ ذمہ داریاں کس لیے ڈالی گئیں؟ انہوں نے بس ایک آیت لی اور اس کا یہ ترجمہ کیا اور کہا کہ بس یہ سب ٹھیک ہے' جو کچھ قرآن کہتا ہے: دیکھیں بات یہ ہے کہ جسے وہ مولا ہدایت دے' بس وہ ہدایت پا سکتا ہے اور جسے وہ چاہے اسے گمراہ کر دے۔ یا میرے اللہ! کیا یہ کہتے ہوئے سینے کے اندر ان کا دل نہیں کانپتا کہ خدا گمراہ کرتا ہے۔ توبہ توبہ! اور کہتے یہ ہیں کہ صاحب! پرویز نے یہ نیا قرآن سمجھا' ہزار برس سے کسی نے سمجھا ہی نہیں۔

خدا کسی کو گمرا نہیں کرتا۔ شیطان گمراہ کرتا ہے

مجھے قرآن کو سمجھنے کا کوئی دعویٰ نہیں۔ میں آپ سے صرف یہ پوچھتا ہوں کہ خدا کے متعلق یہ کہتے ہوئے تمہیں تھوڑی سی جھرجھری بھی نہیں آتی کہ ''وہ گمراہ کرتا ہے''۔ سارے قرآن میں تو یہ لکھا ہوا ہے کہ ''شیطان گمراہ کرتا ہے اور ہم ہدایت دیتے ہیں''۔ لیکن اگر خدا گمراہ کرتا ہے تو یہ رسول کاہے کے لیے' یہ عقل و فکر کاہے کے لیے' یہ قرآن کاہے کے لیے ہے۔ اور جسے وہ ہدایت دیدے وہ ہدایت پہ چلا گیا' جسے وہ گمراہ کر دے گمراہ ہو گیا۔ یہ تو وہی ذمہ داری سے بچنے کی بات ہے۔ جبکہ بات تو صاف ہے۔ لہٰذا یہ یاد رکھو' ہم نے یہ سب کچھ تمہیں کہہ دیا ہے اور صحیح راستہ وہی ہو گا جسے خدا نے صحیح قرار دیا ہے۔ جسے اس نے غلط قرار دیا ہے وہ راستہ غلط ہے۔ یہ اس آیت کا ترجمہ ہو گیا' یہ اس کا مفہوم ہو گیا۔ اس کے بعد یہ بات نہیں ہے کہ میں تمہیں کہہ کے چلا ہوں تو پھر تم اپنے فیصلے کی رو سے کسی راستے پہ

چلے جاؤ وہ راستہ منزل پہ پہنچادے۔ یہ بالکل غلط ہے۔ لہٰذا ایک بار پھر جاتے جاتے میں کہہ دیتا ہوں کہ اس Sign post کو دیکھ لو۔ یہ خدا نے لٹکا رکھا ہے۔ اس نے جس سمت کے متعلق لکھا ہے کہ یہ شہر کی طرف جائے گی تو پھر وہی شہر کی طرف جائے گی' کوئی دوسری سڑک آپ کو شہر کی طرف نہیں لے جائے گی۔ اس لیے اسے سمجھ لو کہ جس راستے کے متعلق اس نے کہا ہے کہ یہ شہر کی طرف نہیں جائے گا' وہ شہر کی طرف نہیں جائے گا' خواہ ہزار راہنما بھی ساتھ لے لو' وہ تمہیں شہر کی طرف نہیں لے جاسکتے۔ اس سڑک پہ' جس پہ اس نے لکھ دیا کہ یہ شہر کی طرف نہیں جائے گی' وہ کبھی شہر کی طرف نہیں جائے گی۔ یہ ہے اس کے معنی عزیزانِ من! یہ نہیں ہے کہ جسے خدا ہدایت دے وہ ہدایت پہ ہوگا' اور جسے وہ گمراہ کردے (معاذ اللہ) وہ گمراہ ہوگا۔ اصل یہ ہے کہ جس راستے کو اس نے کہہ دیا کہ یہ سیدھا منزل تک تمہیں پہنچائے گا' وہی پہنچائے گا۔ جس راستے کے متعلق اس نے کہا کہ یہ راستہ جنت کی طرف نہیں جائے گا' بلکہ تمہیں جہنم کی طرف لے جائے گا' اس پہ چلنے والا ہزار راہنماؤں کے باوجود کبھی جنت میں نہیں پہنچ سکتا۔ وہ آخر کار جہنم میں جائے گا۔ تو یہ قرآنی آیات کا قرآنی مفہوم ہے اور اس کے بعد ساتھ ہی اگلی آیت ہے کہ فَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُونِهٖ (17:97)۔ یاد رکھو کہ انہیں ان کا کوئی بھی نگران' سرپرست' مددگار' ساتھی' رہنما' اس راستے پہ چلا کر' جو اس منزل کی طرف نہیں جاتا' اس راہرو کو صحیح منزل پہ نہیں پہنچا سکتا۔

قرآن تو بار بار کہتا ہے کہ تم اندھے' بہرے اور گونگے نہ بنو

اس کے معنی یہ ہیں: اس صورت حال میں کوئی ان کی مدد نہیں کرسکتا۔ قرآن کہتا ہے۔ وَنَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ (17:97)۔ ذلیل وخوار ہو کر' جسے وہ اوندھے منہ کہتے ہیں' جہنم کا راستہ ان کا مقدر بن جاتا ہے۔ قرآن انہی کو اندھے' بہرے' گونگے کہہ رہا ہے۔ اگر اس نے انسانوں کے متعلق یہ سب کچھ کرنا ہوتا تو پھر اندھے ہوں' بہرے ہوں' گونگے ہوں' کچھ بھی ہوں' ان کے لیے تو مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ (17:97) تباہی ہے' بربادی ہے۔ اور یہ تباہی اور بربادی بھی عارضی اور وقتی نہیں۔ قرآن نے متعدد مقامات پہ یہ بتایا ہے۔ بات دوسری طرف نکل جائے گی ورنہ آج تو محققین کے نزدیک سلسلہ ارتقاء کے سارے انکشافات بتا رہے ہیں کہ جس مقام کے اوپر کوئی نوع رک گئی ہے' وہ وہاں رکی ہوئی ہے' وہ آگے نہیں چل سکتی۔ ارتقاء کی اگلی منزلیں صرف وہ نوع طے کرتی ہے جو اپنے اندر آگے بڑھنے کی صلاحیت پیدا کرلے' جو اس صلاحیت کو کھودے' وہ وہیں رک کے رہ جاتی ہے۔

''یہ رک کے رہ جانے کا مقام'' جہنم کہلاتا ہے۔ اس میں سے نکلنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ وہ تو ہمارے تصور کا جہنم ہے' جسے ہم نے خود اپنے ہاں جیل خانہ تصور کرلیا ہے اور ذہن میں یہ ہوتا ہے کہ بہرحال جی! اس جیل خانے کی سزا کی کوئی مدت ہونی چاہیے۔ ملازدہ بیچارے میرے پاس روز آتے ہیں کہ جی! جسے عمر قید کہا جاتا ہے' وہ بھی تو چودہ سال' دس سال یا سات ہی سال کی گنی جاتی ہے۔ یہ آپ نے کہا کہ جو جہنم میں گیا تو بس وہ جہنم میں ہی رہا صاحب! انہیں کون سمجھائے۔ اصل چیز یہ ہے عزیزانِ من! کہ اس کے احکام' اس کی

ہدایات تو عام سطح کے اوپر سمجھ آتی ہیں لیکن قرآن کے حقائق ذہن کی بلند سطح چاہتے ہیں' قرآن بہت بلند فکر چاہتا ہے۔

اقبالؒ کے نزدیک مُلا کی حیثیت

یہی ہے وہ چیز جس کے لیے اقبالؒ [1] (c.1877-1938) نے یہ کہا ہے کہ جو اپنی ذہنی وفکری سطح کو اتنا نیچا رکھنے والے ہیں' قرآن کے معارف اور حقائق ان کی علمی سطح کو بلندیوں پر لے جاتے ہیں اور اِس کے برعکس:

مکتب و ملا و اسرارِ کتاب

یہ بے چارے مکتبوں کے اور دارالعلوموں کے پڑھے ہوئے ملا ہیں۔ کہاں وہ اور کہاں کتابِ عظیم کے یہ حقائق اور معارف! سچ کہا تھا:

کورِ مادر زاد نورِ آفتاب

جو پیدائشی اندھا ہے' سورج کی روشنی اس کو نصیب ہی نہیں ہو سکتی۔

یہ مکتب ملا کو ''کورِ مادرزاد'' قرار دیتا ہے۔ دراصل بات یہ ہے کہ ان کے ذہن کی سطح اتنی پست ہوتی ہے کہ یہ حقائق وہاں نہیں آ سکتے۔ وہ تو یہ کہتا ہے کہ ہم اپنی نشانیاں دکھاتے چلے جائیں گے۔ ان نشانیوں پہ غور کرنے سے قرآن کے حقائق تمہاری سمجھ میں آئیں گے اور جن کے دارالعلوموں کی دنیا ہی ہزار برس پیچھے ہو' ان کی سمجھ میں کیا خاک آئے گا۔ آپ کبھی ان کے نصاب اٹھا کے دیکھیے' ان کتابوں کو کھولنے سے گھن آتی ہے۔ ان کے ہاں کی پرانے بوسیدہ کاغذ پہ چھپی ہوئی کتابیں اس قسم کی ہیں۔ ان کے اندر جو لکھا ہوا ہوتا ہے' اسے آپ دیکھیے کیا ہوتا ہے: اپنی بچپن کی ذہنی سطح اور امت کو اپنے سے نیچے رکھنا۔ یہ ہے ان کتابوں کا لب لباب۔

مذہبی مدارس کے طالب علموں کی ذہنی کیفیت

عزیزانِ من! مذہب امتوں کو تباہ کر دیتا ہے۔ ان کی ذہنی سطح اونچی ہوتی ہی نہیں ہے۔ صرف راستہ دائیں بائیں بتاتے ہوئے لڑکے کو شہر بھیجیے آپ دیکھیے کہ واپسی پہ وہ کتنا تجربہ حاصل کر کے لوٹتا ہے۔ لہٰذا یہ جو کہا ہے کہ جہنم میں گئے سو ہمیشہ کے لیے گئے تو قرآن یہ کہتا ہے کہ اس سے نکلنے کا کتنا ہی ارادہ کریں گے مگر نکل نہیں سکیں گے۔ یہاں بھی وہی بات کہی ہے کہ اگر اس کی آتش' اس کی آگ' اس کی گرمی' ذرا سی بھی ماند پڑنے لگے گی تو اور بھڑک جائے گی۔

خود گمراہ کیا اور پھر خود ہی جہنم میں ڈال دیا

اس آیت کے مروجہ غلط ترجمے کی رو سے تو خدا ہی گمراہ کر رہا ہے اور پھر خود ہی اس کا نتیجہ جہنم بتاتا ہے۔ سوال تو یہ ہے کہ یہ تو خدا نے کہا کہ جسے ہم گمراہ کر دیں' اسے کوئی راہِ راست پہ نہیں لا سکتا۔ تو پھر اس میں میرا قصور کیا ہے؟ مجھے خود ہی اس نے گمراہ کیا ہے اور اسکے بعد مجھے کہہ رہے ہیں کہ اسے جہنم میں ڈال دیجیے۔ مجھے کاہے کے لیے جہنم میں ڈال رہے ہو؟ اور واقعی کسی کے سامنے یہ بات کرو' وہ کہے گا

[1] بحوالہ سالِ پیدائش ڈاکٹر محمد اقبال' ملاحظہ ہو گلزارِ اردو (حصہ دوم)' سندھ ٹکسٹ بک بورڈ جام شورو۔ سندھ' 1995ء ص۔169۔

Marfat.com

کہ یہ تو بڑی زیادتی ہے: آج بچے سے کہنا کہ آج سکول مت جاؤ' یہاں بیٹھے رہو۔ وہ بیٹھا رہا۔ آدھے گھنٹے کے بعد چابک لے کے پیچھے پڑ جانا کہ آج سکول کیوں نہیں گئے۔ اب اس کے بعد اس قسم کے باپ کے سامنے لب کشائی بھی نہیں کی جا سکتی۔ اس قسم کے باپ کے سامنے کہہ کے دیکھیے' دو اور ٹکا دے گا۔ لہٰذا اس کے لیے تو وہی مسلک ہوگا جو حافظ کہہ گیا ہے:

گناہ گرچہ نہ بود از خطائے ما حافظ

گناہ ہماری مرضی سے نہیں ہوا' اس میں ہماری خطا نہیں ہوئی' وہ خود کراتا ہے:

تو برطریق ادب پیش دگنا ہے من است

لیکن ادب کا تقاضا یہی ہے کہ اس سے کہے کہ نہیں جی! میری غلطی ہے۔

کیا خوب کہا: ادب کا تقاضا ہے! پہلی آیت میں یہ تھا' جس کے غلط ترجمے سے جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا ہے' یہ مراد لیتے ہیں کہ جسے وہ گمراہ کر دے حالانکہ بات یوں نہیں ہے۔ بات یوں ہے کہ ذٰلِکَ جَزَآؤُهُمْ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا (17:98)۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ ان لوگوں نے ہمارے قوانین سے انکار کیا' سرکشی برتی۔ یہ وجہ ہے کہ انہوں نے ہماری آیات سے خود کفر کیا۔ ایک ہی سانس میں کہا۔ آپ قرآن کو کیا سمجھتے ہیں؟ عزیزانِ من! میں عرض کر رہا ہوں کہ انہوں نے قرآن کو سمجھا ہی نہیں۔

قرآنِ حکیم تو متضاد تعلیم پیش ہی نہیں کرتا

وہ جو قرآن نے کہا تھا کہ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ (6:92)۔ انہوں نے خدا کا صحیح اندازہ نہیں کیا۔ انہوں نے سمجھ رکھا ہے کہ خدا کی ہر بات نرالی اور اچھنبے والی ہونی چاہیے' ورنہ اس نے تو ایک ہی سانس میں کہہ دیا ہے کہ جسے ہم گمراہ کر دیں' اسے کوئی راہِ راست پہ نہیں لا سکتا اور اس گمراہی کا نتیجہ جہنم ہے۔ کیوں؟ ذٰلِکَ جَزَآؤُهُمْ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا (17:98)۔ اس لیے کہ انہوں نے ہماری آیات کا انکار کیا تھا۔ دیکھیے خدا کی اس کتاب میں کیسا تسلسل ہے اور اس سے بڑے اعجازوں میں ایک یہ ہے کہ اس میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ اگر ایک فقرے میں کوئی مصنف اپنی کتاب میں کچھ لکھے اور اس کے بعد کچھ اور لکھے' تو پھر دیکھیے کہ اس کتاب کا حشر کیا ہوگا۔ انسانی مصنفوں کی بھی یہ کیفیت ہوتی ہے۔

عزیزانِ من! بیس سال پہلے کی لکھی ہوئی کتاب کے اندر اگر آج کوئی کہہ دیتا ہے کہ صاحب! وہاں تو تم نے یہ کہا تھا' آج یہ کہتے ہو' انسان ہے وہ کہہ سکتا ہے لیکن اس خوددار مصنف کی آنکھیں زمین میں گڑ جاتی ہیں کہ یہ متضاد باتیں جو کہتا ہے۔ لیکن یہاں خدا کی کتاب میں آپ دیکھ رہے ہیں کہ خدا ایک ہی سانس میں کہے جا رہا ہے کہ ذٰلِکَ جَزَآؤُهُمْ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا (17:98)۔ انہوں نے ہمارے قوانین کی صداقت سے انکار کر کے اپنے لیے غلط راستہ تجویز کر لیا تھا' جس کا نتیجہ تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں۔ اس

Marfat.com

انکار اور اقرار پر بنیادی چیز تو ساری ذمہ داری کی ہے۔ قَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا (17:98)۔ کہتے یہ ہیں کہ ہاں صاحب! اس زندگی کے بعد ایک اور زندگی ہے۔ اس میں سارے اعمال کا حساب ہوگا۔ ایک ایک چیز سامنے آئے گی۔ اس کے نتیجے کے طور پر جنت اور جہنم کا فیصلہ ہوگا۔ وہ کہتے ہیں: یہ سب غلط ہے۔ یہ انسان کا جسم ہے' جس پہ موت آئی تو مر گیا' ریزہ ریزہ ہو گیا' اللہ اللہ خیر سلا' کس کا اٹھنا کس کا اٹھانا' کس کی دوبارہ زندگی! یہ سب کچھ نہیں۔ کہا: یہ ہے وہ بنیادی چیز جسے ذمہ داری کہتے ہیں۔ قانونِ مکافاتِ عمل پہ ایمان کی بات ہے۔ یہ جو میں کر رہا ہوں' اس کا نتیجہ مجھے بھگتنا پڑے گا۔ اس سے نکلنے کی' اس سے فرار کی' راہ یہ ہے کہ یہ کہہ دیا جائے کہ زندگی اسی دنیا کی زندگی ہے۔ اگر میں یہاں انتظام ایسا کر لوں کہ پکڑا نہ جاؤں تو راوی عیش لکھتا ہے۔ اور جب معاشرے کے اندر یہ خرابیاں عام ہو جائیں تو پھر پکڑے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا:

رہیں نہ رند' یہ زاہد کے بس کی بات نہیں
تمام شہر ہے' دو چار دس کی بات نہیں

تمام شہر کو کیا کرو گے۔ لیکن اگر یہ ایمان ہو تو سوال یہ نہیں ہے کہ میں یہاں پکڑا جاتا ہوں یا نہیں پکڑا جاتا۔ میں دنیا کے کسی حصے میں کیوں نہ چلا جاؤں ضرور پکڑا جاؤنگا۔ مجھے ضرور خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ یہ قانونِ مکافاتِ عمل پہ ایمان ہے۔ کئی مفرور اشتہاری مجرم' کئی کئی سال عذاب کے احساس کی یہ کیفیت لیے کہ کہیں پکڑا نہ جاؤں' کئی دفعہ گرفتاری دینے کے لیے خود آ جاتے ہیں۔

یہ چیز بڑی بنیادی ہے کہ زندگی صرف یہیں ختم نہیں ہوتی۔ قرآن کہتا ہے کہ اس بنیادی چیز سے انکار کی وجہ سے یہ ساری چیزوں میں بے باک ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ جو جی میں آئے کر لیا جائے۔ یہاں انہوں نے انتظام کر رکھا ہوتا ہے کہ پکڑا نہ جاؤں' پکڑا بھی جاؤں تو چار پیسے دیدونگا۔ یہ ہے بنیادی چیز اور یہ جو آج ہر کس و ناکس دیکھ رہا ہے کہ اتنے جرائم' اتنی عام بداخلاقیاں' اتنی عام حیات سوزیاں' ہر قسم کی برائیاں عام ہیں۔ ان کی وجہ یہی نہیں ہے کہ کسی کو یقین ہی نہیں ہے کہ میں پکڑا جاؤنگا بلکہ یہاں قانون کا احترام اٹھ گیا ہے۔ یہاں جو قانون کے نظم و ضبط والی قوتیں تھیں' ڈھیلی پڑ گئیں۔ یہاں جو اس کے متعلق اطمینان ہوا تو اس کے بعد عزیزانِ من! اپنے سینوں کو ٹٹولیے تو سہی' کہیں اس کا یقین اور ایمان ہے کہ ''بات یہیں ختم نہیں ہو جانی' مجھے ضرور ایک دن کسی عدالت کے سامنے جانا ہے' مجھے ضرور سزا ملنی ہے''۔ یہ ہے جسے آپ ایمان بالآخرت کہتے ہیں۔ یہ کچھ اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ کے الفاظ دہرا لینے سے نہیں ہوتا۔ سوچیے' ہے کسی کے دل میں یہ یقین!

ایمان بالآخرت کی عملی شکل

عزیزانِ من! یہ یقین ہو تو پھر اس قسم کی کوئی چیز سرزد ہو ہی نہیں سکتی۔ انسان اتنا بے خوف ہو ہی نہیں سکتا۔ مگر اب یہ یقین نہیں

Marfat.com

ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ مخالفین کھلے بندوں یہ کہہ دیتے تھے کہ ہمیں اس کا یقین نہیں ہے۔ ٹھیک ہے کہ اب تو سیکولر والوں نے کھلے بندوں کہا: ہم منافقت برتتے ہیں۔ عموماً افراد اپنی زبان سے یہ نہیں کہتے کہ ہم منافقت برتتے ہیں کیونکہ ابھی اس معاشرے میں یہ چیز ہے کہ یہ اسے بُرا سمجھتے ہیں۔ حالانکہ عملاً ان میں سے ہر شخص انکار کر رہا ہے اور یہ اس کا Trust ہے' یہ ٹرسٹ ہے عزیزانِ من! جو آج کل آپ کے سامنے آتا ہے۔ مصیبت یہ ہے کہ یہ ساری چیزیں رسم بن کے رہ گئیں۔ رمضان کے مہینے میں روزہ ایک ایسی چیز ہے کہ مئی جون کی گرمیاں ہوں' دوپہر کی شدت ہو' پیاس سے تڑپ رہے ہوں' کمرے میں تنہائی ہو' ٹھنڈے پانی کی صراحی بھی رکھی ہوئی ہو' کوئی دیکھنے والا بھی نہ ہو' اس شدتِ پیاس کے باوجود آپ پانی کا ایک گھونٹ نہیں پیتے۔ میں نے کہا ہے کہ یہ چیز بھی ہمارے ہاں ایک رسمی سی ہوگئی ہے کہ روزے میں صبح سے شام تک نہ کھایا جائے' نہ پیا جائے کیونکہ اس سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ ہمارے ہاں محض اک ٹوٹ جانے کا خیال ہے' ورنہ یہ چیز نہیں ہے کہ "جب کوئی دیکھنے والا نہیں ہے تو بھی شدتِ پیاس کے باوجود میں نے اس کی خلاف ورزی نہیں کرنی"۔ اگر اس چیز کا ایمان ہے کہ مجھے ایک دن کسی عدالت کے سامنے جانا ہے' مجھے میرے کیے کی سزا ضرور ملنی ہے تو معاشرے کا کوئی فرد کسی قسم کا کوئی جرم کر ہی نہیں سکتا۔

تمام تر معاشرتی تباہیوں اور بربادیوں کی وجہ اور اس کا علاج

ایسا شخص جو روزے میں پانی نہیں پی رہا ہوتا' یہ ایمان اس کے دل میں بھی نہیں ہوتا۔ یہ بھی فقہ ہی کا مسئلہ لیے بیٹھا ہوتا ہے کہ اگر میں نے پانی پی لیا تو روزہ ٹوٹ جائے گا۔ بعض چیزیں تو آدمی Habituallyکرتا رہتا ہے' عادتاً کرتا رہتا ہے۔ ایسی ہی ہماری نمازیں اور ہمارے روزے ہیں۔ میں ہر ایک کو یہ چیز نہیں کہتا۔ روزے رکھنے اور نمازیں پڑھنے کے باوجود ہمارے معاشرہ میں یہ ساری تباہیاں آ رہی ہیں۔ یہ کیوں آ رہی ہیں؟ بہرحال ابھی آپ کے ہاں معاشرے میں دو' چار' دس فیصد صحیح روزہ دار ہیں۔ یہ اکیلے تنہائیوں میں جب کوئی دیکھنے والا نہیں ہوتا' اس وقت بھی پانی نہیں پیتے اگر یہ چیز اس ایمان پر ہو کہ میرے ہر عمل کا نتیجہ میرے سامنے آنا ہے' اس وقت کے پانی پینے کا بھی آنا ہے تو اس طرح کے ایمان والا شخص باہر جا کے یہ کچھ نہیں کرے گا' جہاں فرض کرو کوئی نہ دیکھنے والا ہو یا اسے یقین ہو کہ یہاں دیکھنے والا نہیں ہے تو بھی وہ کوئی چیز خلافِ قانون نہیں کرے گا۔ لیکن آج روزہ رکھنے کے باوجود کیفیت یہ ہے کہ یہ سب کچھ ہو رہا ہے: روزہ نہیں توڑے گا۔ وہ جیل کاٹ رہا ہوگا۔ پکڑا جائے گا تو اس کے بعد وہ کہے گا کہ "میرے لاگے ناں آئیں' میں روزے نال آں"[1] اور روزے کے ساتھ تو آپ کو پتہ ہے روزے کی شان ہوتی ہے۔ اس وقت تو عام طور پہ کہتے سنا ہوگا: "اومینوں کجھ نہ کہیں' اوئے میں روزے نال ہیگا ایں' جیوں شارٹ مار دا ہیگا اے"[2]۔ گرمیوں کے دن کے روزے میں عصر کے وقت آپ دیکھیے' ہر روزے دار شارٹ مارتا ہے حالانکہ اس کو ضبط سکھایا گیا تھا' اس کو تو سہار سکھائی گئی تھی' اس کو تو برداشت کرنا سکھایا گیا تھا۔ سب سے زیادہ برداشت کرنے والا روزے دار ہوتا ہے۔ اس کا اپنے ہاں سارا دن برداشت کا امتحان ہو رہا ہے اور آج سب سے زیادہ بے برداشتہ وہ روزے

---

[1] ارے میرے پاس نہ آنا' میں روزے سے ہوں [2] ۔ارے مجھے کچھ نہ کہنا' میں روزے سے ہوں۔ یوں ہوتا ہے جیسا کہ کرنٹ لگا رہا ہے۔

Marfat.com

دار ہوتا ہے۔ دیکھا ایک چیز کے رسم کے طور پہ ادا کرنے اور ایک چیز کے مفہوم کے اعتبار سے ادا کرنے میں کتنا فرق ہو جاتا ہے۔ آج یہی چیز ہم میں نہیں ہے کہ ''میں اپنے ہر عمل کا ذمہ دار ہوں۔'' ہم صرف رسمی طور پر یہ کچھ کیے جا رہے ہیں' اس کام کی حکمت کیا ہے' وہ ہمارے سامنے نہیں ہے۔ یہی معاشرتی برائیوں کی وجہ ہے۔

صلوٰۃ کے متعلق قرآن حکیم کا ارشاد اور ہمارا عمل

صلوٰۃ کے متعلق قرآن نے یہ کہا ہے کہ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ (29:45)۔ ہر بے حیائی سے' ہر نامعقول حرکت سے صلوٰۃ تمہیں روک دے گی۔ کیا آج یہ صلوٰۃ روک رہی ہے؟ اس صلوٰۃ کی صاحب! کتنی پابندی ہوتی ہے: اذان آئی' سارے کام چھوڑ دیئے' نہیں' بھائی! میں نے باجماعت نماز پڑھنی ہے' میں نے آج تک کبھی کوئی نماز باجماعت سے قضاء نہیں کی۔ چلے جا رہے ہیں' صلوٰۃ کے لیے بھاگے ہوئے جا رہے ہیں' پوری شدت سے پڑھ رہے ہیں' اس کے سارے ارکان و تعدیل اسی طرح سے ادا کر رہے ہیں۔ یہاں تک ہاتھ اٹھاؤ' یہاں باندھو' اتنا جھکو' یہ زاویہ بنے۔ یہ تمہارے الفاظ؟ ہاں! ان کا تلفظ یوں صحیح ہو' مخرج میں یوں ہو۔ یہ سارا کچھ کر رہے ہیں بلکہ ان کے Behalf وہ کر رہا ہوتا ہے اور یہ سوچ رہے ہوتے ہیں کہ پھر آج جا کے آٹے میں کیا ملانا ہے۔ جی! وہ کونسی صلوٰۃ ہے جو روکتی ہے۔ قرآن کہتا ہے: ہر قسم کے بے حیائی کے کاموں سے' ہر قسم کے گناہ سے' الصلوٰۃ تمہیں روک دے گی۔ آج کیوں نہیں روک رہی؟ Habits ہو جاتی ہیں' مذہب میں یہ چیزیں Habit کے اعتبار سے کرتے ہیں۔ یہ ساری بحثیں کہ چار رکعتیں ہیں یا دو رکعتیں ہیں' ایک سجدہ ہے۔ یہ تمام محض رسما اور عادتا ہوتی ہیں۔ سوال تو یہ تھا کہ آج صلوٰۃ برائیوں سے نہیں روکتی۔ کیوں؟

اچھے یا برے راستے پر چلنے کا اختیار انسان کے اپنے پاس ہے

قرآن کریم نے کہا تھا کہ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ (29:45)۔ جو صلوٰۃ تمہیں بُرے کاموں سے روکے گی' آپ اسے قرآنی صلوٰۃ کہیں گے' جی! کہا کہ یہ وہ چیز ہے جس کی بناء پہ جرأتیں بے باک ہو جاتی ہیں۔ جب اس سے ایمان اٹھ جائے کہ زندگی آگے بھی چلنی ہے' میرے ہر عمل کا نتیجہ میرے سامنے آنا ہے تو زندگی کی ڈگر بدل جاتی ہے۔ وہ صلوٰۃ قرآنی صلوٰۃ نہیں رہتی۔ کہا: یہ وجہ ہے کہ برائیاں نہیں رکتیں۔ اب وہ سمجھ لیا جو کہا تھا کہ جو غلط راستے پہ چلتا ہے' اسے کوئی صحیح راستے پہ نہیں لا سکتا۔ یہ نہیں ہے کہ اسے خدا غلط راستے پہ چلاتا ہے۔ یہ ہے اصل چیز۔ یہ سوال ان کی طرف سے اٹھا ہے کہ صاحب! ہمارے سامنے مر گیا' دیکھا کہ جسم ریزہ ریزہ ہو گیا' طبعی جسم کی Disintegration ہو گئی۔ اس کے بعد پھر نئے سرے سے اٹھنا ہے۔ قرآن تو یوں بات کرتا ہوا آگے چلا جاتا ہے۔ اَوَلَمْ يَرَوْا (17:99)۔ لہٰذا یہ کہا ہے کہ انہوں نے اعتراض تو فلسفیانہ سا' تدریجی سا' اٹھایا ہے۔ دراصل ''یروا'' کے معنی ہوتا ہے: ''جو چیز محسوس طور پہ سامنے دیکھ لو''۔ چنانچہ فرمایا کہ یہ بات چھوڑ دو۔ ان سے کہو کہ ذرا دیکھو تو سہی' کیا تم نے یہ نہیں دیکھا ہے؟ کہا: اَنَّ اللّٰهَ

Marfat.com

الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ (17:99)۔ یہ تو مانتے ہو کہ ایک وقت وہ بھی تھا کہ جب یہ ارض وسما' یہ کائنات' نہیں تھی اور پھر یہ سب کچھ وجود میں آ گیا تو جس خدا کی یہ کیفیت ہے کہ جب کچھ بھی نہیں تھا' وہ اتنی بڑی کائنات وجود میں لے آیا۔ قَادِرٌ عَلٰٓی اَنْ یَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ (17:99)۔ تو کیا اب اس کو اتنی بھی قدرت' اتنا بھی اختیار' نہیں رہا ہے کہ بہر حال کچھ تو' ریزہ ریزہ ہی سہی' چلو' تمہاری بات مان لیں' کچھ نہ ہونے سے اس نے اتنی بڑی کائنات پیدا کر دی او! یہ ریزہ ریزہ بھی تو کچھ موجود ہوگا تو کیا ''مِثْلَهُمْ'' اس کی مثل پہ میں ایک زندگی پیدا نہیں کر سکتا؟ کیا دلیل ہے! بڑے سے بڑا دہریہ Scientist بھی اس چیز سے انکار نہیں کر سکتا صاحب! کہ یہ کائنات عدم (Nothingness) سے وجود (Being) میں آئی ہے۔ کہا: اتنی سی بات ہے' تم یہ کہتے ہو یہ یونہی By chance ہو گیا۔ کہا: یہ تو تمہارے Scientific اصول کے خلاف ہے۔ تم تو سائنس کی دنیا میں چانس (Chance) کو مانتے ہی نہیں ہو۔

یہ پوری کائنات Cause & Effect پر مبنی ہے

سائنس کی دنیا اور توہمات کی دنیا میں فرق ہے۔ توہمات میں کہتے ہیں کہ ''جی! پتہ نہیں ہے ایویں ایناں نوں تاپ چڑھ گیا ہیگا''[1] Scientist یہ نہیں کہتا کہ ''ایویں'' چڑھ گیا[2]۔ یہ کہنا اس کے اصولِ سائنس کے خلاف ہے کہ ایویں چڑھ گیا۔ وہ تو ہر Effect کا Cause بتائے گا کہ یہ اس لیے چڑھ گیا۔ Scientist سے یہ کہا کہ تم بتاؤ' تم تو بائی چانس (By Chance) نہیں کہہ سکتے۔ میں نے کہا ہے کہ یہاں Scientist یا سائنس تو اپنا اعترافِ علل کر رہی ہے۔ کہا: کائنات کے سلسلہ میں تو مانتے ہو کہ یہاں کچھ نہیں تھا لیکن پھر بھی یہ کائنات وجود میں آ گئی' کوئی میٹریل (Material) پہلے نہ تھا۔ مسالہ نہ تھا' وہ اتنی بڑی کائنات وجود میں لے آیا تو کیا اب اس کی قدرت میں یہ نہیں رہا؟ یہاں تو بہر حال ہڈیاں' چورا' کچھ نہ کچھ جتنا بھی ہے' تھا تو سہی۔ Disintegrate ہی ہوا ہے ناں۔ تم تو خود کہتے ہو: مادہ (Matter) کبھی بھی معدوم نہیں ہو سکتا۔ سائنس کا اصول ہے کہ مادہ (Matter) شکل تو بدلتا ہے' معدوم نہیں ہوتا۔ تو شکل ہی بدلی ہوئی ہے۔ جب وہ کچھ نہیں تھا تو اس نے اتنا کچھ بنا دیا تو اب تمہارے ذہن کے مطابق' تمہارے جسم کی کچھ شکل بدلی ہے تو وہ دوبارہ یہ شکل نہیں پیدا کر سکتا۔ چلو' تمہارا ہی اصول لیا جائے لیکن اس نے یَخْلُقَ مِثْلَهُمْ (17:99) کہا ہے کہ کیا اس زندگی کی مثل وہ ایک زندگی پیدا نہیں کر سکتا؟ کیا بات ہے قرآن کی صاحب! مِثْلَهُمْ ٹھیک ہے' یہی نہیں کہ یہی گوشت' اسی قسم کا' اسی شکل کا' اسی طبعی جسم کا' یہ انسان! مثلھم۔ اس کے لیے کیا مشکل ہے۔ وَجَعَلَ لَهُمْ اَجَلًا لَّا رَیْبَ فِیْهِ (17:99)۔ یہاں تو طبعی زندگی کی ایک مدت متعین ہے۔ اس طبعی زندگی کی مدت میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ اس کے بعد آگے کہتے ہو کہ آگے ناممکن ہے تو جس نے یہ پہلی طبعی زندگی کو تخلیق کیا ہے' اس کے لیے اس کی مثل تخلیق کر دینا کونسا مشکل ہے۔

---

[1] جی ہمیں معلوم نہیں ہے' انہیں یونہی تپ چڑھ گیا ہے۔ [2] کہ یونہی' بلاوجہ ہو گیا ہے۔

Marfat.com

Nothingness (معدوم) سے Being (ہستی) میں آنے تک کا عمل

آج سے چودہ سو سال پہلے کے ایک بدو کے لیے یہ دلیل اور آج کے آپ کے ہاں کے سب سے بڑے Scientist (سائنسدان) کے لیے بھی یہ دلیل۔ کیا خوب ہے! آج کا یہ سائنسدان ۱۴۰۰ سال پہلے کا وہ بدو نہیں ہے۔ وہ اس بناء پہ اس کا انکار نہیں کرسکتا کیونکہ وہ اس کو مانتا ہے کہ یہ Nothingness سے Being میں آئی ہے اور یہ پوری کی پوری کائنات ہمارے اصولِ سائنس کے خلاف نہیں اور اس سے آگے بڑھ کر یہ کہ آج بھی اس کائنات میں اضافہ اصولِ سائنس کے خلاف نہیں ہے۔

مومن کی پہچان اس فکر سے ہوتی ہے کہ میری انتہا کیا ہے

یہ سائنسدان ابتدائے آفرینش کی بات اس لیے مانتے ہیں کہ اس سے کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی اور انتہا کی بات سے اس لیے انکار کرتے ہیں کہ ساری ذمہ داریاں عائد ہوجاتی ہیں۔ اصل بات تو ذمہ داری کی ہے۔ اسی لیے وہ جو ایک مردِ مومن اقبالؒ (C.1877-1938) کی پکار ہے بڑی اہم ہے۔ وہ بڑی بات صاف کرگیا ہے کہ:

خرد مندوں سے کیا پوچھوں کہ میری ابتدا کیا ہے
کہ میں اس فکر میں رہتا ہوں' میری انتہا کیا ہے [1]

مومن کی یہی فکر ہے کہ میری انتہا کیا ہے۔ فَاَبَى الظّٰلِمُوْنَ اِلَّا كُفُوْرًا (17:99)۔ کچھ تو یہ ہے کہ ظلم کرنے والے لوگوں کی باتوں سے نفرت یا انکار بڑھتا ہے۔ ان کے اسی فعل (Action) کی بناء پر تو کہا ہے: ظلم کی بناء پہ پکڑے جائیں گے۔ ان کا انکار' ضد نفرت اور ہٹ دھرمی ہی انہیں ادھر نہیں آنے دیتی ورنہ عقل و فکر کی بناء پہ تو بڑے سے بڑا سائنسدان' Scientist بھی یہاں آکے مجبور ہوجائے گا کہ اس کو تسلیم کرے۔ باقی رہا یہ کہ تم وہ نظام چاہتے ہو' جس سے ظلم مٹتا ہے تو ٹھیک ہے' اس کے لیے آپ کو کچھ خرچ بھی کرنا پڑے گا' قربانیاں دینی پڑیں گی' ایثار کرنا پڑے گا۔ یہ کچھ تو کرنا ہی ہوگا۔ تم اپنے بدن کی صحت کو قائم رکھنے کے لیے کتنی محنت کرتے ہو۔ جسے پرہیز کہتے ہیں وہ یہی ایثار ہی تو ہے کہ یہ نہیں کھانا' اتنا کھانا ہے' اتنا سونا ہے' اتنا سیر کرنا ہے۔ تم نے کتنی پابندیاں عائد کی ہوئی ہوتی ہیں۔ کہتا ہے: اس کے لیے بھی تو یہ کچھ کرنا پڑے گا۔ قُلْ لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَآىِٕنَ رَحْمَةِ رَبِّيْۤ اِذًا لَّاَمْسَكْتُمْ خَشْيَةَ الْاِنْفَاقِ ؕ وَكَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا (17:100)۔ اور پھر یہ بات نہیں کہ تمہیں یہ ڈر ہے کہ صاحب! اگر ہم نے صرف یہ کردیا' دوسروں کی مدد کرنے کے لیے یہ دیدیا تو ہم بھوکے مرجائیں گے' ہمارے پاس کچھ نہیں رہے گا۔ تم میں ایسے بھی ہیں کہ جن کے پاس اس کے باوجود بہت کچھ رہتا ہے۔ وہ بھی یہی کچھ کرتے ہیں' کچھ اس میں سے چار پیسے دینے کے لیے موت پڑتی ہے۔ یہ کیا ہوتا ہے؟

---

[1] اقبال: بالِ جبریل' 1996' ص۔70

Marfat.com

کہنے لگا کہ اگر انسان کو اس کی حالت کے اوپر چھوڑ دیا جائے تو یہ بڑا تنگ دل واقع ہوا ہے۔ اس کے قلب کے اندر کشاد نہیں پیدا ہوتی۔

غلط نظام کے اندر پیدا ہونے والے خدشات

قرآن قلب کے اندر کشاد پیدا کر دیتا ہے اور پھر یہ بات' عزیزانِ من! یہی نہیں ہے کہ جی وہ توکل بخدا بیٹھے ہیں۔ توکل بخدا بیٹھنے والے بھوکے مر جاتے ہیں۔ یہ اس نظام کے اندر ہوتا ہے' جہاں رزق کی تقسیم خدا کے قاعدوں کے مطابق ہوتی ہے' وہاں کسی کو یہ پریشانی نہیں ہوتی کہ اگر میں نے یہ دیدیا تو کل کو اپنے تنگ حال وقت میں میری مدد کون کرے گا۔ یہ باطل نظام ہے جس میں ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ اگر آج میں نے یہ کچھ دیدیا تو کل کو مجھ پہ مصیبت پڑی' اگر میرے بچے بھوکے رہ گئے' کل کو یتیم ہی ہو گئے تو ان کو کون پوچھے گا۔ انہیں ایک وقت کی روٹی بھی کہیں سے نہیں ملے گی۔ یہ ہے وہ چیز جو غلط نظام کے اندر انسان میں ایثار کا جذبہ پیدا نہیں ہونے دیتی۔ انسان کے قلب میں کشاد پیدا ہونے والی یہ چیز وہیں پیدا ہو سکتی ہے جہاں یہ کہا جائے گا: اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (11:16)۔ ہم تمہارے رزق کے ذمہ دار ہیں۔ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ (6:152)۔ ہم تمہارے رزق کے بھی ذمہ دار ہیں' تمہاری اولاد کے رزق کے بھی ذمہ دار ہیں۔ وہ چھوٹی سی رقم کی انشورنس کرا کے آدمی آدھی رات اطمینان سے سو جاتا ہے' کچھ تسلی ہو جاتی ہے کہ ایسا وقت آیا تو کچھ بچت ہو جائے گی اور اگر تمہاری اور تمہاری اولاد کی بھی پوری Insurance دی ہوئی ہو تو اس کے بعد کسی فکرمندی کا سوال ہی نہیں ہے۔ لہٰذا میں نے وہ دردِ سر کا ہے کو لینا ہے' مجھے کیا ضرورت ہے کہ میں اپنے ہاں یہ چار پیسے سنبھالتا پھروں۔

انسان کی ذمہ داری تو صرف اس نظام کو قائم رکھنا ہے اور بس

یہاں اس عالم النفس میں تو صرف تمہیں اس نظام کو قائم و دائم رکھنا ہے۔ باقی رہا تمہاری اور تمہاری اولاد کے رزق کا مہیا کرنا تو یاد رکھو کہ اس کا دینا میری ذمہ داری ہے۔ مجھے اس کی ضرورت ہی نہیں ہے کہ میں اس Insurance کے بعد جو تم نے ہمیں دے رکھی ہے اسے اپنے لیے رکھوں:

عشق میں ایک تم ہمارے ہو
باقی جو کچھ ہے سب تمہارا ہے

اسے ایمان کہتے ہیں۔ یہ اُس نظام میں حاصل ہوتا ہے عزیزانِ من! جو اِس بات کی ضمانت دیتا ہے۔ یہاں انسان یہ کہتا ہے کہ ایک تم ہمارے ہو یہ ہے Insurance ! باقی جو کچھ ہے سب تمہارا ہے۔ اس سے کس قدر سکون کی زندگی بسر ہوتی ہے!

آلامِ روزگار کو آساں بنا دیا

کیسے بنا دیا؟

جو غم ملا اسے غمِ جاناں بنا دیا

اس نظام کا نتیجہ: نہ خوف نہ حزن

''ایہدی فیس نئیں دینی جی''[1] جو غم ملا' اسے غمِ جاناں بنا دیا۔ یہ عزیزانِ من! نظام قائم کرنے والی بات آئی ہوئی ہے۔ یہ قرآن کے فقہی مسائل نہیں ہیں کہ جن میں کہا گیا ہو کہ ہاتھ یہاں باندھ لو' ہاتھ یہاں چھوڑ دو' گو یہ بھی قوموں کے اندر Discipline پیدا کرنے کے لیے نہایت ضروری چیزیں ہیں جیسے سپاہی کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ بوٹ کا تسمہ کیسے باندھو' تمہاری پیٹی کیسی ہونی چاہیے۔ یہ نظم وضبط سوسائٹی ہے۔ اصل چیز اقدار ہیں' جن پر ایمان کی ضرورت ہے صاحب! وہ نظام ہے جس میں یہ Insurance ہوتی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ وہ نظام ہے' جسکے لیے شروع سے ٹکراؤ چلا آ رہا ہے۔ مفاد پرست قوتیں اس کو قائم ہونے دینا نہیں چاہتیں۔ حق کا علمبردار اسے قائم کرنے کے لیے' اس رہن گاہ میں اترتا ہے اور سب سے بڑی مثال قرآن ہمیشہ کشمکشِ فرعون وموسیٰؑ کی دیتا ہے۔ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ فَسْـَٔلْ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اِذْ جَاۗءَهُمْ فَقَالَ لَهٗ فِرْعَوْنُ اِنِّىْ لَاَظُنُّكَ يٰمُوْسٰى مَسْحُوْرًا (17:101)۔ اس کشمکش کے اندر کیا ہوتا ہے؟ کہا: قاعدہ یہ ہے کہ یہی نہیں ہوتا کہ قومیں یکلخت پہلی ہی غلطی کے اوپر تباہ کر دی جاتی ہیں۔ غلطیاں ہوتی ہیں۔ ان کے چھوٹے چھوٹے خمیازے سامنے آتے ہیں۔ بظاہر یہ چیزیں چھوٹی چھوٹی نظر آتی تھیں۔ یہ سب کچھ ہونے کے بعد پھر یہ ہوتا ہے کہ وہ مملکت ہی غرق ہو جاتی ہے۔ ہم نے موسیٰؑ کو قومِ فرعون کی آخری تباہی سے پہلے نو کھلی کھلی نشانیاں دی تھیں۔ جب موسیٰؑ قوم فرعون کی طرف آیا تو فرعون نے سب کچھ سننے کے بعد اس سے کہا: یا تو تمہیں خود کو دھوکا لگ گیا ہے یا تم دوسروں کو دھوکا دیتے ہو۔

حضرتِ موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کی باہمی گفتگو

فرعون کو حضرت موسیٰؑ نے کہا تھا کہ یاد رکھو کہ ہر غلط معاشرے کا نتیجہ تباہی ہوتا ہے۔ جواب ملا تھا کہ جاؤ جاؤ تم دھوکے میں ہو' یا فریب دینے والے ہو یا فریب خوردہ ہو۔ ہماری مملکت کے اس طول وعرض میں بہت کچھ ہے۔ پوچھیے نہیں اگر پہاڑوں کو کھودیں تو ہم ساری دنیا میں سونا سپلائی کر سکتے ہیں۔ ٹھیک ہے' کھودو تو پھر سپلائی ہوتا ہے۔ یہاں فرعون کی طرف سے قرآنِ حکیم ایک جامع لفظ لایا ہے کہ اے موسیٰ! تم فریب خوردہ ہو' تم جانتے ہوئے بھی نہیں جانتے ہو کہ ہماری Potentialities کیا ہیں' ہم کیا کر سکتے ہیں۔ دراصل جو بھی صحیح بات کہتا ہے' اسے یہی کہا جاتا ہے یا اسے پاگل قرار دے دیا جاتا ہے' یا اس کو دھوکے باز کہا جاتا ہے۔ قَالَ لَقَدْ عَلِمْتَ مَآ اَنْزَلَ هٰٓؤُلَاۗءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ بَصَاۗىِٕرَ وَاِنِّىْ لَاَظُنُّكَ يٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا (17:102)۔ حضرت موسیٰؑ نے اس کو یہ جواب دیا کہ فرعون! بات یہ نہیں ہے۔ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں' یہ قیاس نہیں ہے' اندازے نہیں ہیں' فریب خوردگی اور فریب کاری

---

[1] اجی! اس کی کوئی فیس نہیں دینی۔

Marfat.com

نہیں ہے' کچھ حقائق ہیں جنہیں بیان کرتا ہوں اور علم کی بنیادوں پر یہ بیان کر رہا ہوں' اپنی طرف سے نہیں کہہ رہا' کائنات کے پروردگار کی طرف سے یہ باتیں تم سے کہہ رہا ہوں۔ تم مجھے یہ کہہ رہے ہو کہ میں: رَجُلٍ مَّسْحُوْرٌ فریب خوردہ ہوں اور میں دیکھ رہا ہوں کہ تم ایسے انسان ہو' جو تباہی کی طرف بڑھتے چلے جا رہے ہو۔ دیکھو' تم تو کنویں میں گر رہے ہو۔ کیا جواب ہے صاحب! میری فکر چھوڑ دو' اپنی آنکھیں کھول کے دیکھو۔ میں تمہیں دیکھ رہا: یٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا (17:102)۔ اے فرعون! تم برباد ہو رہے ہو' تم میں عقل کی کمی ہے' تباہی کی طرف بڑھ رہے ہو۔ پھر آپ کو معلوم ہے کہ فَاَرَادَ اَنْ یَّسْتَفِزَّهُمْ مِّنَ الْاَرْضِ (17:103)۔ اس کے بعد کا آخری حربہ تو یہ ہے کہ ان کو ملک سے نکال باہر کرو۔ دو بڑے آئے رسول بن کے ہمیں سمجھانے والے! جب مستبد کی' ظالم کی' نوبت یہاں تک پہنچ جائے تو سننا تو ایک طرف رہا' وہ کہتے ہیں کہ سننے والے بھی اس طرح سے کہتے ہیں: نظر بند کر دو' ملک سے باہر نکال دو' پھانسی پہ چڑھا دو کہ سنانے والا بھی کوئی نہ رہے۔ کہا: یہ وقت آتا ہے' وہ مقام آ جاتا ہے۔ پھر؟

قوموں کی تباہی ہمیشہ اپنے محسنوں کو فراموش کر دینے سے ہی واقع ہوتی ہے

فَاَغْرَقْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ جَمِیْعًا. وَّقُلْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ لِبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اسْكُنُوا الْاَرْضَ (17:103-104)۔ اتنی بڑی مملکت کا مالک تباہ ہو گیا' ختم ہو گیا۔ اس مقام پہ وہ ختم ہوتے ہیں' جو کہنے والے کی بات سننے کی تاب نہ لائے اور اس کا گلہ گھونٹ دے کہ یہ بات نہ کہے۔ جب بات کہنے والا ہی کوئی نہیں رہے گا' تباہی تو آئے گی عزیزانِ من! وبائی امراض کے زمانے میں آپ ڈاکٹروں کو نکال کے باہر بھیج دیجیے تو اس کے بعد پھر دیکھو' تباہی آتی ہے یا نہیں؟ کہنے والا آپ نے ختم کر دیا۔ یہ کرتے یہ ہیں کہ جو صحیح بات کہتا ہے' اس کا گلہ گھونٹ دیتے ہیں۔ کیا بات ہے تباہی کی! اس کہنے والے کا گلہ گھونٹ دیجیے' پھر بچنے کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی۔ یہ وہی بنی اسرائیل قوم تھی جنہیں تم نے اپنے ہاں اس طرح محکوم اور مغلوب قوم بنا کے رکھا تھا۔ وہی قوم اتنی بڑی مملکت کی وارث ہو گئی لیکن ہم نے ان سے بھی یہ کہہ دیا کہ یاد رکھو! اس طرح سے یہ مملکت تمہیں مل تو گئی ہے لیکن وہ ملی ہے عظیم رہنما حضرت موسیٰ کے تدبر اور ایمانداری اور شرافت کے صدقے میں۔ اب اسے سنبھالنا تمہارا کام ہے۔

ہم نے بنی اسرائیل سے کہہ دیا تھا کہ یہ تمہیں مل تو گئی ہے' اگر تم نے بھی یہی کچھ کیا' جو فرعون نے کیا ہے تو تمہارا بھی وہی حشر ہو گا۔ باقی رہا یہ سوال کہ کیا فرعون سے ہماری کوئی ذاتی دشمنی تھی؟ ہم نے کہہ دیا تھا کہ نہ فرعون سے ہماری کوئی ذاتی دشمنی تھی' نہ تم ہماری چہیتی اولاد ہو۔ یہاں تو اصولوں کی بات ہے۔ اس نے غلط روش اختیار کی ہوئی تھی' وہ تباہ ہوا۔ تم غلط روش اختیار کرو گے' تم تباہ ہو جاؤ گے۔ اس کو بھی مہلت ملی تھی' تمہارے ہاں بھی یہ ہو گا۔ ایک دفعہ سو سال تک کے لیے تباہی آئے گی' یاد کرو گے کہ تباہی کیا ہوتی ہے۔ عزیزانِ من! بابل کی اسیری کا زمانہ آیا۔ آپ بنی اسرائیل کے اس زمانے کے نوحے دیکھیے۔ عزیزانِ من! پھر بھی ان سے سنبھلا نہیں گیا۔ کہا: پھر اگر

Marfat.com

دوبارہ یہ کچھ کرو گے تو پھر تم تباہ ہو جاؤ گے۔

افراد زندہ رہتے ہیں مگر قوم زندہ نہیں رہتی

ہم نے ان سے کہہ دیا تھا: فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ جِئْنَا بِكُمْ لَفِيْفًا (17:104)۔ تو پھر یاد رکھو اس کے بعد تمہاری پوری کی پوری قوم تباہ ہو جائے گی۔ تباہی کے یہی معنی نہیں ہوتے کہ اس قوم کے افراد کو زمین نگل جاتی ہے' وہ معدوم ہو جاتے ہیں۔ نہیں' ان افراد کو زمین نہیں نگل جاتی بلکہ وہ چلتی پھرتی لاشیں رہ جاتی ہیں اور اس طرح ان کا شمار زندہ قوموں کے زمرے میں نہیں ہوتا۔ وہ ذلیل ہوتی ہیں۔ اس سے تو بہتر ہوتا ہے کہ مٹ جائیں عزیزانِ من! زندہ رہنا اور ذلیل و خوار ہو کر زندہ رہنا! اس سے تو مٹ جانا' معدوم ہو جانا' ختم ہو جانا لاکھ درجہ بہتر ہے' اچھا ہے:

یہ سسک سسک کے مرنا غمِ عشق میں بلا ہے
کوئی ظلم مجھ پہ ہوتا مگر ایک بار ہوتا ❶

ختم ہو جانا تو زیادہ آسان ہوتا ہے۔ ابھی تک زندہ ہو' سانس لے رہے ہو' چل پھر بھی رہے ہو۔ وَبِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَبِالْحَقِّ نَزَلَ (17:105)۔ چنانچہ راہنمائی کے سلسلہ میں تمہارے لیے خدا کی طرف سے ایک موقع پھر آ گیا۔ یہ صحیفہ حق کے ساتھ اتارا ہے۔ تم تک یہ حق کے ساتھ پہنچا ہے۔ چلا ہے تو اس میں باطل کی کوئی آمیزش نہیں تھی۔ پہنچا ہے تو راستے میں بھی کوئی آمیزش نہیں ہوئی ہے۔ اس فقرے میں بڑی عجیب چیز ہے۔ وَبِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَبِالْحَقِّ نَزَلَ (17:105)۔ عربی جاننے والے اس سے لطف اندوز ہونگے کہ یہ ''انزلنٰہ'' اور ''نزل'' کے کیا معنی ہو گئے۔ خیر' کہاں تک بڑھاؤں داستان! وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا (1:105)۔ اے رسولِ ﷺ خدا! ہم نے تمہیں بھی موسیٰ کی طرح رسول اسی لیے بھیجا ہے تا کہ انہیں ان لوگوں کی غلط سوچوں کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کرو' صحیح راستہ چلنے والوں کو بشارت دو کہ تمہارا ہر قدم تمہاری منزل کو تمہارے قریب لاتا چلا جا رہا ہے' اس لیے تمہیں بھیجا ہے۔

قوموں کی تعلیم و تدریس کا طریق اور انقلاب کا قرآنی مفہوم

وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ وَّنَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا (17:106)۔ ان کا بھی یہ تقاضا تھا کہ یہ سارا قرآن ''جملۃ واحدۃ'' کیوں نہیں نازل ہو گیا۔ ایک ہی جگہ یہ جو ساری کتاب ہے' وہ نازل ہو جائے۔ عزیزان من! قوموں کی تعلیم' تدریس' اصلاح' بتدریج (Gradual) ہوتی ہے۔ یہ اصلاح آہستہ آہستہ ہوتی ہے۔ Over night فساد (Disorder) تو برپا ہو سکتا ہے'

---

❶ غالب کا یہ شعر اور مطالب الفرقان فی دروس القرآن النحل کے صفحہ نمبر 102 پر چھپنے والا یہی شعر دیوانِ غالب میں یوں تحریر ہے:
کہوں کس سے میں کہ کیا ہے' شبِ غم بُری بلا ہے — مجھے کیا بُرا تھا مرنا' اگر ایک بار ہوتا

Marfat.com

انقلاب نہیں لایا جاسکتا۔ انقلاب (Revolution) کا تو مادہ (Root) ہی (ق ل ب) ہے' یہ تو دل کے بدلنے سے ہی بدلا جاتا ہے اور دل کے بدلنے میں تو بڑا وقت چاہیے۔ جو کچھ پہلے سے چلا آ رہا ہے' اس کو مٹانا' پھر اس کی جگہ حق کی بات کہنا ہے' یہ لمبا پروگرام ہوتا ہے۔ یہ راتوں رات کی چیز نہیں ہوتی۔ یہ ٹھیک ہے کہ اگر آپ ایک فرد کا نام بدل دیں گے تو کچھ وقت کے بعد انسان اس نام سے مانوس ہو جاتا ہے لیکن اگر کسی صبح کو یہ اعلان کر دیجیے کہ لاہور کی ہر سڑک کا نیا نام رکھ دیا گیا ہے تو اس کے بعد "دیکھو ہوندا کی اے ایتھے فیر"[1] یہ ہے وہ انقلاب جس کے لیے کہا جا رہا ہے۔ جسے یہ انقلاب کہتے ہیں یہ فساد ہوتا ہے' یہ Disorder ہوتا ہے۔

انقلاب بتدریج آتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ جب تک نفسیات میں تبدیلی نہیں ہوتی' تمہارے ذہن اور قلوب نہیں بدلتے' خارجی ماحول میں صحیح تبدیلی پیدا نہیں ہو سکتی۔ تباہی تو آ سکتی ہے' فساد تو برپا ہو سکتا ہے مگر اصلاح (Reformation) نہیں ہو سکتی۔ قرآن کہتا ہے کہ ہم نے اسی لیے بتدریج نازل کیا تھا کہ یہ ایک درسی کتاب (Academic Book) تھی۔ لڑکے کو بتدریج پہلی جماعت سے ایم اے تک لے جانا تھا' ان میں آہستہ آہستہ ہی ترقی ہونی تھا۔ اس لیے ہم نے اس کو ایسے نازل کیا ہے اور اسی لیے تم بھی اسی طرح سے قوم کی اصلاح کرو' بتدریج اصلاح کرو۔ یہ ہے اصلاح کا طریقہ عزیزانِ من! میں کہا کرتا ہوں کہ قوم کے اندر صحیح اصلاح کا صرف ایک ہی طریقہ ہے: نوجوان نسل کی تعلیم ہی اس انداز سے کی جائے کہ ان کے دل و نگاہ کو بدل دیا جائے تو قوم خود بخود بدلی ہوئی آپ کے سامنے آ جائے گی۔ جس قوم کے ہاتھوں آج آپ ٹوٹ رہے ہیں' یہ ہماری تیار کردہ وہ قوم ہے جسے ہم نے گذشتہ پچیس سال میں بنایا ہے۔ کم بختو! یہ ہمارے نوجوان جن کے ہاتھوں آپ اپنا رونا رو رہے ہیں' کن کے بنائے ہوئے ہیں؟ کنہوں نے ان نوجوانوں کی تعلیم و تربیت اس قسم کی کی ہے؟ ہم نے کی ہے لیکن ہم ہیں کہ اس کا الزام اپنے سر لیتے ہی نہیں۔ یہی چیز تو ہماری بربادی کی وجہ ہے' یہی تو ہماری کمزوری ہے۔ یہ منافقت ہے کہ ہم سارا الزام ان کے اوپر دے مارتے ہیں کہ یہ نوجوان بے حیا ہو گیا ہے' یہ بدتمیز ہو گیا ہے' سرکش ہو گیا ہے' بیباک ہو گیا ہے۔ یعنی اس بگاڑ میں ہماری کوئی ذمہ داری نہیں تھی۔ کس نے یہ ایسا کیا ہے؟ تم اس کے ذمہ دار ہو اور یہ ہے بتدریج اصلاح کرنے کا طریقہ۔ آپ اپنے بچوں کی صحیح تعلیم و تربیت کا انتظام کیجیے۔ قرآن کو اس طرح تیئس سال تک بتدریج نازل کرنے کا یہ مقصد ہے۔

قرآن کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کا طریق

عزیزانِ من! اس کے سمجھنے کا بھی یہی طریق ہے۔ اس کو بتدریج سمجھا جا سکتا ہے۔ اس کی ایک ایک منزل سے بتدریج گزر کے اسے عمل میں لایا جا سکتا ہے۔ قُلْ اٰمِنُوْا بِهٖٓ اَوْ لَا تُؤْمِنُوْا ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖٓ اِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ يَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا (17:107)۔ ان سے کہہ دو کہ یہ بات ایسی نہیں ہے کہ اگر تم خدا کے احکامات نہ مانو گے تو پھر وہ کائنات ڈھے جائے گی۔ سارا دارومدار تمہارے اوپر ہے۔ یہ سارا کچھ تم نے مان لیا تو خدا' خدا ہے۔ قرآن کہتا ہے یہ تو سوال ہی نہیں ہے۔ ساری دنیا

---

[1] پھر دیکھو کہ یہاں پھر کیا کچھ ہو جاتا ہے۔

Marfat.com

آنکھیں بند کر لے سورج پھر بھی روشنی دیتا چلا جائے گا۔ وہ روشنی دینے کے لیے تمہارا محتاج نہیں ہے' تم اس کے محتاج ہو۔ جن لوگوں کو علم ہے' آج جو لوگ علم رکھتے ہیں' وہ دیکھ سکتے ہیں کہ قرآن کیا ہے۔ وہی بات جو میں نے پہلے کہی تھی کہ قرآن علم کا متقاضی ہے۔ یہ اس طرح علم سے سمجھ میں آ سکتا ہے۔ کہتا ہے: ان کی کیفیت یہ ہے کہ جب ان کے سامنے یہ آیات آتی ہیں' یہ غور و فکر کرتے ہیں تو وہ اس کے سامنے بے ساختہ جھک جاتے ہیں۔ اس لیے کہ وَيَقُوْلُوْنَ سُبْحٰنَ رَبِّنَآ اِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا (17:108) ۔ وہ اس پہ یقین رکھے ہوتے ہیں کہ ہاں جو کچھ تُو اس کے اندر کہتا ہے' یہ واقعی ہو کے رہے گا۔ اب علم کی بنیادوں کے اوپر یہ یقین حاصل ہوگا۔ یہ یقین (Conviction) حاصل ہو کے رہے گا۔

دل کی گدازی انسان کو حساس بنا دیتی ہے

وَيَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ يَبْكُوْنَ وَيَزِيْدُهُمْ خُشُوْعًا (17:109)۔ وہ جب پھر اپنی یا اپنے معاشرے کی اس قسم کی حدود شکنی' قانون فراموشی' اس قسم کی تباہیوں' بربادیوں' پر نگاہ ڈالتے ہیں تو واقعی دل کی گہرائیوں سے ان کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگ جاتے ہیں کہ یہ "کیا ہونے والا ہے؟ کیا ہوگا؟" اس سے ان کے دل کا گداز زیادہ بڑھ جاتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو جائے۔ جس طرح بھی ممکن ہو اس قوم کو بچا لیا جائے۔ اس کے بعد ان کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں' یہ رونے لگ جاتے ہیں۔ مگر یاد رہے کہ وہ یہ نہیں ہوتا کہ ان کے جذبات رقیب ہوتے ہیں' ان کے اعصاب کمزور ہو جاتے ہیں کہ وہ یہ دیکھ کر اس لیے رونے لگ جاتے ہیں کہ اگر یہ کچھ نہ کیا گیا تو کیا حشر ہونے والا ہے۔ اس احساس سے ان کے دل کی گدازی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ ان کا دل آنسو بن کے ٹپک پڑتا ہے کہ اگر ہماری یہ چیز نہ ہوئی تو کیا ہوگا۔ بعض اوقات انسان کم ہمتی کی بناء پر بھی رونا شروع کر دیتا ہے لیکن یہ تو اعصاب کی کمزوری ہے۔ جبکہ ایک رونا یہ ہے کہ اپنی تباہی' اپنے انجام پہ نگاہ رکھ کے' اور اس سے متاثر ہونے کے بعد' آنکھیں پرنم ہو جائیں۔ "یا اللہ اس قوم کا کیا حشر ہونے والا ہے؟" یہ دلِ دردمند روتا ہے۔ اس طرح سے عزیزانِ من! قوم کی حالت کو دیکھ کے' خود رسول اللہ ﷺ کی یہ کیفیت تھی۔ جو جتنا زیادہ حساس ہوتا ہے اتنی ہی اس کی یہ کیفیت ہوتی ہے۔

خدا کا صحیح تصور صرف قرآن حکیم میں محفوظ ہے

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ (17:110)۔ عربوں کے ہاں اللہ کا تصور موجود تھا۔ رسول اللہ ﷺ کے والد کا نام عبداللہ تھا لیکن یہ اسلام سے پہلے کی بات ہے۔ جیسے ہم خدا کی صفات (Attributes) کہتے ہیں' ان کے ہاں یہ صفات کا تصور نہیں تھا۔ لہٰذا اس پہ وہ اعتراض کرتے تھے کہ اس تصور کا اللہ کیوں نہیں ہے جو ہم مانتے چلے آ رہے ہیں۔ اللہ کا صحیح تصور صرف قرآن نے دیا ہے یا یوں کہیے کہ قرآن حکیم نے صرف خدا کا تصور بدلا ہے۔ اور تصور بدلنے سے تو ساری بات بدلتی ہے۔ یہ جنہیں آپ صفاتِ خداوندی کہتے

ہیں' یہ اس کا صحیح تصور قائم کرتی ہیں۔ قرآن نے کہا ہے کہ یہ ضد کی بات نہیں ہے کہ تم اللہ کہتے ہو' رحمٰن کیوں نہیں کہتے۔ اس نے کہا کہ اَیًّامَّا تَدْعُوْا (17:110)۔ او بھئی! رحمٰن کہو تو کیا' اللہ کہہ دو تو کیا۔ سوال یہ نہیں ہے۔ فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى (17:110)۔ یہ ساری صفات اسی ذات کی ہیں۔ یہ مختلف صفات ہیں جو قرآن دیتا ہے۔ ان کی بنیادوں کے اوپر جو تصور قائم ہوتا ہے' وہ خدا کا صحیح تصور ہے۔ لہٰذا بات صرف نام کی نہیں ہے۔ آپ کو بنگلہ دیش کے اس لڑکے کا خط یاد ہوگا' عزیز الرحمٰن اس کا نام تھا' وہ ایم اے کا طالبعلم تھا۔ یہ پوچھتے ہیں بنگلہ دیش میں کیا ہوا؟ اس نے کہا تھا کہ یہ پاکستان والے جو قرآن کا اسلام یا نظام لیے پھرتے ہیں' انہوں نے ہمارا اچھا بھلا دیسی خدا جسے ہم ایشور ❶ کہتے تھے' اس کو نکال کے ایک بدیشی ❷ خدا کو' اللہ کو ہمارے اوپر ٹھونس دیا۔ عزیز الرحمٰن نام ہے عزیزانِ من! پھر نفرت یہاں تک پہنچ جاتی ہے۔ وہ کہتا تھا: ہمارے سارے نام ہی بدل دیئے۔ یہ جو ہمارے ہاں راجیو' گاجیو وغیرہم ہوا کرتے تھے' کیسے خوبصورت نام تھے! اور ان کی جگہ کہیں سے جناب شارق اور خالق لے آئے ہو۔ سو جب نفرت بڑھتی ہے تو اس کا یہ نتیجہ (Consequence) نکلتا ہے۔ اور یہ تھی وہ قوم جو ہم نے تیار کی تھی۔

صفات خداوندی کی حقیقت

عزیزانِ من! قرآن کہتا ہے: سوال یہ نہیں ہے کہ نام اللہ ہو یا رحمٰن ہو۔ یہ ضد کی بات نہیں۔ ہم مناظرے نہیں کرتے۔ یہ اس کی صفاتِ حسنٰی ہیں۔ یہ اس کے Assets ہیں۔ ان میں سے اُسے اس کے کسی Asset سے پکارو' بات بن جاتی ہے۔ باقی رہی یہ بات کہ تم اس کے بھجن گاؤ' سنکھ بجا بجا کے پکارو' ناقوس پہ اس کا نام الاپو اور اس طرح تم خوش ہو جاؤ کہ خدا کو پالیا۔ تم یہ کچھ کرتے ہو' اور خاموشی سے کرتے ہو۔ ان کی Details میں نہیں جاتے اور کہتے ہو کہ اس قسم کی چیزوں کے اندر نہیں جانا چاہیے۔ سوال یہ نہیں کہ خدا کو کس نام سے پکارا جائے۔ سوال یہ ہے کہ کس قسم کے خدا کو مانا جائے' خدا ہو۔ صحیح ایمان کے معنی یہ ہیں کہ اس کی ان تمام صفات کو مانا جائے' جن سے اس نے قرآن میں اپنا تعارف کروایا ہے۔ وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا (17:110)۔ یہ ٹھیک ہے کہ لفظی نزاع میں نہ پڑو۔ اسے اس کے ذاتی یا صفاتی ناموں میں سے جس نام سے بھی پکارو' ٹھیک ہے۔ یہ سب اسی ذات کے حسن و زیبائی کے متنوع گوشے (Aspects) ہیں۔ ایک ہی حقیقت کے مختلف پہلو ہیں۔ یہاں بعض نے صلوٰۃ کے معنی دعا کے لیے ہیں۔ یہ بھی قرآن شریف کے نزدیک صحیح ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس میں اونچی آواز سے کچھ کہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس میں آہستہ آواز سے کچھ کہو۔ مگر یہاں یہ بات نہیں ہے۔ ٹھیک ہے' ان کے مختلف طریقے ہیں۔ اس کو یاد کر لیجیے۔ میں یہاں صرف یہ ایک بات کہنا چاہتا ہوں کہ یہاں خاموشی سے کہنے کے جو معنی ہوتے ہیں' وہ یہ ہیں کہ ''دل میں ایک تصور پیدا ہو جائے' الفاظ نہ آئیں۔''

---

❶ بھگوان' پرمیشور ❷ غیر ملک کا

Marfat.com

الفاظ کی بات آگے آئے گی۔ اونچی آواز سے آئیں یا وہ ویسے ہی خاموشی سے آئیں۔ بغیر الفاظ کے صرف تصور یا خیال ہوتا ہے' یہ متعین نہیں ہوتا۔ یہ نہیں ہونا چاہیے۔ اور صلوٰۃ میں نہ تو اس کی ضرورت ہے کہ اسے چلا چلا کر پکارا جائے اور نہ ہی بالکل خاموشی ہے۔ بلکہ ان دونوں کی درمیانی راہ اختیار کرنی چاہیے۔

خیالات یا تصورات کے لیے الفاظ کی اہمیت

خدا نے ہمیں اپنے خیالات کو قرآن کے الفاظ میں دیا ہے۔ یہ وحی ہے جس میں الفاظ ہیں اور لفظوں کے معنی ہیں۔ صحیح تاثر اس وقت ہوتا ہے جب وہ خیال لفظ میں آ کے ادا ہو' ورنہ آپ یوں بیٹھے ہوئے خیالات کی دنیا میں' Imagination کے اندر یہ کرتے رہیں تو آپ دیکھیں گے کہ وہ چیز ادا نہیں ہوتی' عملاً بھی سامنے نہیں آتی۔ جب آپ اسے ایک لفظ دیدیتے ہیں تو پھر اس کی وہ متعین شکل سامنے آتی ہے۔ پھر اس کے لیے اگلی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اس میں دیکھا جاتا ہے کہ یہ صحیح سمت کی طرف جا رہی ہے یا نہیں جا رہی ہے۔ لفظ بڑی ضروری چیز ہے۔

قرآنی الفاظ کا کوئی بدل نہیں ہوسکتا

کوئی خیال' جو لفظ کے بغیر پیدا ہوتا ہے' وہ آدمی کے اندر واہمہ ہوتا ہے۔ کوئی لفظ بغیر خیال کے نہیں ہوتا اور اسی طرح کوئی خیال بغیر لفظ کے نہیں ہوسکتا۔ اسی لیے قرآن بلفظ ہی قرآن ہے۔ اس کا ذہنی مفہوم قرآن نہیں ہے کہ ہاں' ہم نے سمجھ لیا ہے۔ یہ چیز متعین الفاظ میں آنی چاہیے۔ پھر یہ متعین شکل اختیار کرتا ہے۔ اسے یاد رکھیے اور یہ جو قرآن کے لفظ ہیں' ان کا کوئی بدل نہیں ہوسکتا۔ دنیا کی اور زبانوں میں تو ایک طرف رہا' عربی میں بھی اس کا بدل نہیں ہوسکتا اور اس کا تو یہ عجیب اعجاز ہے۔ ہمارے ہاں عربی زبان کی ایسی تفسیریں بھی ہیں کہ جنہوں نے کچھ زیادہ تفسیر نہیں کی' صرف قرآن کے الفاظ کے آگے عربی زبان کے اور الفاظ رکھ دیئے ہیں۔ آپ ان کو اکٹھا کیجیے اور ان کو ایک طرف رکھیے۔ پھر آپ دیکھیے ان میں اور تفاسیر کے عربی الفاظ میں' اسی عربی زبان میں' زمین و آسمان کا فرق ہے۔ وہ کوئی ان پڑھ لوگ نہیں تھے۔ آج بھی سن و بلاغت کے امام ہیں۔ آپ جلالین کو دیکھیے' باپ بیٹے کا نام ہے صاحب! لیکن ان کی تفسیر میں جہاں انہوں نے قرآن کے الفاظ کی جگہ عربی کے مرادف الفاظ لکھے ہیں' نظر آتا ہے صاحب! کہ لفظ اور لفظ میں کیا فرق ہے۔ وہ تو پھر بھی دوسرے عام انسانوں کی بات ہے۔ یہ احادیث' جن کے مفہوم سے نظر آتا ہے کہ ہاں رسول اللہ کی سچی ہوسکتی ہیں ان احادیث کو قرآن کی آیتوں کے اندر رکھ دیجیے' دور سے نظر آجاتا ہے کہ یہ قرآن ہے اور یہ کچھ اور ہے اگر وہ اسی رسول کے الفاظ ہیں۔ قرآن میں الفاظ کی اتنی اہمیت ہے۔

اردو میں نماز کے فتنہ پرویزؒ کی مخالفت نیز تین نمازوں اور نو روزوں کا الزام

یہ جو فتنہ اٹھا تھا کہ اردو میں نماز پڑھ لی جائے اور پھر تعجب خیز بات یہ کہ اسے پرویز کے ذمہ لگایا جاتا ہے' جھوٹ کی کوئی حد نہیں

ہوتی' سب سے پہلے میں نے' اسی پرویز نے' اس کی مخالفت کی تھی۔ کراچی میں بیٹھے ہوئے' میں نے لاہور میں قدِ آدم اشتہارات بھیجے تھے کہ یہ بہت بڑا فتنہ ہے۔ سوال اردو اور عربی کی نماز کا نہیں ہے۔ سوال تو قرآن کے الفاظ کا ہے۔ قرآن تو اپنے الفاظ میں ہی قرآن ہے۔ اس کے لفظ کا متبادل کوئی اور نہیں ہوسکتا اور صلوٰۃ میں چونکہ قرآن پڑھنا ضروری ہے' اس لیے کسی دوسری زبان میں صلوٰۃ نہیں ہوسکتی۔ میں نے یہ قدِ آدم اشتہارات لاہور کے در و دیوار پہ آویزاں کیے۔ وہی دس برس سے آپ یہاں یہ بھی بن رہے ہونگے کہ یہ شخص تین نمازوں اور نو روزوں کا قائل ہے۔ پھر یہ بھی کہ یہ منکرِ حدیث بھی ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی کہ یہ اردو میں نماز کا قائل ہے۔ ٹھیک ہے سچ کی تو ایک حد ہوتی ہے عزیزانِ من! یعنی آپ بات سچی کہدیں بس اس کے بعد ختم۔ جھوٹ کی کوئی حد ہی نہیں ہوتی' بولتے چلے جایئے۔ خالص شے کی تو حد ہوتی ہے۔ ''گوالے دی کوئی حد ای نئیں' جناں مرضی دودھ وچ پانی پائی جاؤ''[1]۔ وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ یَكُنْ لَّهٗ شَرِیْكٌ فِی الْمُلْكِ وَلَمْ یَكُنْ لَّهٗ وَلِیٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَكَبِّرْهُ تَكْبِیْرًا (17:111)۔ یہ اس سورت کی آخری آیت ہے۔ آپ کو یاد ہے' میں کہا کرتا ہوں کہ قرآن آخری آیات میں پوری سورۃ سمٹا کے رکھ دیتا ہے۔ کہیئے الحمدللہ کہ ہر باعثِ تہنیت و تدریس و تحسین جو کوئی تصوراتِ خیال و گمان میں ہیں' سب اس ذات کے لئے ہیں۔ اَلَّذِیْ اسے اس کی ضرورت نہیں ہے کہ کوئی عصائے پیری بننے کے لیے بیٹا ہونا چاہیے' بوڑھا ہو جائے تو وہ کما کے کھلائے گا۔ اس نے عیسائیت کے باطل تصور کو کاٹ کے رکھ دیا۔ وَّلَمْ یَكُنْ لَّهٗ شَرِیْكٌ فِی الْمُلْكِ (17:111)۔ یہ جو تم بتوں کو گھر کے شریک بنا لیتے ہو' یہ تو جہالت ہے۔

خدا کے اقتدار کو تسلیم کرنے کی عملی شکل

عزیزانِ من! شَرِیْكٌ فِی الْمُلْكِ (17:111)۔ اصل شرک اقتدار کے اندر کسی اور کا شریک ہو جانا ہے' اقتدار میں غیرِ خداوندی کی شرکت ہے' یہ شرک ہے عزیزانِ من! وَلَمْ یَكُنْ لَّهٗ شَرِیْكٌ فِی الْمُلْكِ (17:111)۔ صرف خدا کا اقتدار۔ یہ ہے وہ چیز جسے آپ اسلامی نظام یا اسلامی مملکت کہتے ہیں۔ خدا کے اقتدار کے معنی ہیں کہ سارا کاروبار اس کی کتاب کے مطابق ہو' اس کے دیئے ہوئے ضابطہ آئین کے مطابق ہو۔ اس کے خلاف اس میں کوئی اور ملاوٹ نہیں' کوئی Compromise نہیں' کوئی بین بین کی سی صورتِ حال نہیں۔ سبحان اللہ! اس دور میں جو کسی کے جی میں آئے کہدے۔ شَرِیْكٌ فِی الْمُلْكِ (17:111)۔ اس سے بڑا شرک اور کیا ہوگا! اسلامی مملکت تو بڑا فائدہ دیتی ہے۔ یہ بڑی ڈھال ہوتی ہے۔

چھ جنوری 1947ء کو ہم کراچی میں تھے' جب لوٹ پڑی ہے۔ ہندو جاتے ہی نہیں تھے تو وہاں مہاجران ہندوؤں کو نکالنے کے لیے گئے تھے۔ ''او تھے اوناں نے کبھی دتی سی اوناں نوں''۔[2] نکل کے بھاگے تھے اور جب فساد ہوتا ہے تو ہر طرف لوٹ مچ جاتی ہے۔

---

[1] گوالے کی کوئی حد ہی نہیں ہوتی جتنا اس کا جی چاہے' وہ دودھ میں پانی ملاتا چلا جائے۔

[2] تو وہاں جو انہوں نے انہیں گھور کر دیکھا

Marfat.com

وہاں صراف کی ایک بہت بڑی دوکان تھی۔ وہ ہندو کی تھی۔ اس کے باہر لکھا ہوا تھا: یہ اسلامی صراف کی دوکان ہے' اسے نہ توڑیئے''۔ ٹھیک ہے' اسلام بڑی ڈھال ہے۔

وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ (17:111)۔ خدا کا جو منزہ تصور قرآن پیش کرتا ہے' وہی خدا کا حقیقی تصور ہے۔ اس کی رو سے یہ غلط ہے کہ اس کے اقتدار واختیار میں کوئی اس کا شریک ہے۔ عزیزانِ من! بحث نہ لفظوں کی ہے' نہ کسی سے مناظرے کی ہے' جو الملک ہے' جو اقتدار ہے' اگر اس میں Sovereignty خدا کے احکام واقتدار وحدود کے ساتھ کسی انسان' کسی دوسری مملکت' کسی دوسرے تصور کی' آپ نے شرکت کر دی تو یہ خدا کے ساتھ شرک ہو گیا۔ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلِيٌّ مِّنَ الذُّلِّ (17:111)۔ کیا کہتے ہو کہ اسے اپنی کمزوری کی وجہ سے' کسی مددگار کی ضرورت ہے؟ قطعاً نہیں۔ یہ تو اس لیے ضروری ہوتا ہے کہ فلاں بات میں سقم رہ گیا ہے' اِدھر سے پورا نہیں ہو سکتا' فلاں بات میں کچھ کمزوری ہے' وہ اُدھر سے پوری کر دی جائے۔ یعنی ہمارے ہاں جو دین ہے وہ تو ٹھیک ہے' اسلام ہے۔ لیکن اب اس کے اندر جو کچھ کمزوری آ گئی ہے' اسے اِدھر اُدھر سے ٹھیک کر دیا جائے۔ اس کے اندر معیشت کیا ہو گی؟ ہم کہتے ہیں کہ یہ سوشلزم ہو گی۔ مِّنَ الذُّلِّ (17:111)۔ یہ کہ کمزور رہ گیا ہے' اتنا ناقص رہ گیا ہے۔ اس کے جواب میں کہا: کاہے کے لیے یہ کچھ کر رہے ہو؟ اس کی کوئی کمزوری نہیں ہے' اس میں کوئی نقص نہیں ہے۔ خدا بلاشریک وسہیم [1] تمام قوتوں کا واحد مالک ہے۔

المتکبر کا قرآنی مفہوم

تمہارا فریضہ تو صرف وَكَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا (17:111) ہے۔ دو لفظ ہیں۔ وَكَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا تکبیر یا کبرہ یا کبر کے لفظ سے والمتکبر بنا ہے۔ قرآن نے خدا کو المتکبر کہا ہے۔ یوں تو اردو میں اس کا ترجمہ متکبر کرتے ہیں جبکہ کسی فرد کے متعلق کہا جائے کہ وہ تو بڑا متکبر ہے تو ہمارے ہاں متکبر کا لفظ رعونت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ عربی زبان میں المتکبر ایسا نہیں ہے۔ کیا بات ہے یہ! کبریائی صرف اس کے لیے ہے۔

Sovereignty belongs to Him alone

خدا تو بغیر سہیم وشریک' تمام قوتوں کا مالک ہے۔ اس کا نظام قائم کر کے انسان نے تو اسے دیگر تمام نظام ہائے حیات اور قوانین زندگی پر غالب کرنا ہے۔

خارجی کائنات میں حکمرانی خدا کی اور انسانی دنیا میں یعنی ارض پر انسان کی کیوں؟

برادرانِ عزیز! میں اس تکبیر یا کبرہ یا کبریا المتکبر کا کیا ترجمہ کروں۔ ''ک ب ر'' اس کا مادہ ہے۔ اس کے معنی ہوتے ہے: ''وہ بلند ترین مقام جس میں کوئی دوسرا شریک ہی نہ ہو''۔ اور پھر اس میں ''ملک'' پہلے کہا ہے کہ بات ملک کی ہے۔ یاد رکھو کہ خارجی کائنات

---

[1] حصے دار' شریک

ہیں مملکت خدا کی ہے جبکہ ہمارے ہاں کی کائنات یعنی انسانی دنیا میں مملکت ہماری ہے۔ یہ تو تقسیم ہے ناحق' اور بٹوارہ ہے باطل۔ مثلاً دو بھائیوں نے آپس میں جائیداد بانٹی تھی۔ منتظم نے کہا تھا کہ بانٹ دو۔ ٹھیک ہے' ہم بانٹ دیتے ہیں۔ بہت اچھی بات ہے۔ ایک بھائی نے دوسرے بانٹنے والے کو کہا کہ یہ ایک تحفہ ہے۔ یہ باپ چھوڑ گیا ہے' تقسیم کر لیتے ہیں: صحنِ خانہ سے چھت تک کا یہ اتنا سا حصہ میرا ہو گیا۔ اب بامِ خانہ تا ثریا' چھت سے لے کے آسمان تک' تیری جائیداد ہے۔ ''توں کی یاد کرے گا کہ وڈے بھائی نے کوئی تقسیم کیتی ہیگی'' سی ساڈی' کوئی گل نئیں اسی اینیں اچ ای گذارہ کرلاں گے' جا موج لے''[1] پہلا Sentence آپ کے ہاں Constitution آئین میں یہی آیا تھا جس کی میں نے مخالفت کی تھی۔ اس میں کہا گیا تھا کہ ساری کائنات کے اندر اقتدارِ خداوندی ہے۔ میں نے کہا کہ یہ ٹھیک ہے ''چھت توں لے کے آسمان تکرائے ایہدا' تے کوٹھا' تے کوٹھے دا صحن تہاڈے مولا بخش دا''[2] صاحب! میں نے کہا: ذرا نیچے اتریئے۔ بات اس کوٹھے کے تقسیم کی تھی۔ یہ بتایئے کہ یہ کوٹھا کس کا ہے؟ یہی تو مشکل آ جاتی ہے۔ ''او تو کوٹھے اچ دو کرائے دار برداشت ای نہیں کردا''[3]۔ جب تک کعبے سے بت باہر نہیں نکلتے' اس میں خدا داخل نہیں ہو سکتا۔ وَكَبِّرْهُ تَكْبِيرًا (17:111)۔ یہ ہے اصل الاصل! کیا الفاظ ہیں!! تمہارا قول اب یہ ہے جو مانتے ہو کہ ''لاشریک لہ فی الملک'' کہ اقتدار میں کوئی اس کا شریک نہیں ہے۔ اب تمہارا کام وَكَبِّرْهُ تَكْبِيرًا (17:111)۔ ہے یہ از خود نہیں ہوگا۔ یاد رکھو' تمہیں اب اس Sovereignty کو اس دنیا کے اندر متمکن کرنا ہوگا۔ تمہیں یہ کرنا ہوگا۔ کبرہ کا حکم ہے۔ وَكَبِّرْهُ تَكْبِيرًا (17:111)۔ وہی ایک ایسا ہے جس کی کبریائی کائنات میں ہے۔ اسی کی کبریائی ارض کے اندر بھی قائم کرنی ہے۔ وَكَبِّرْهُ تَكْبِيرًا (17:111)۔ اس کو بڑا بناؤ جو حق ہے بڑے بنانے کا۔ اگر اس کے لیے بڑا ہی لفظ لانا ہے تو اس کا اقتدار قائم کرو جو اقتدار قائم کرنے کا حق ہے۔ كَبِّرْهُ تَكْبِيرًا آپ سورۃ مدثر میں دیکھیے۔

لفظ مدثر کا قرآنی مفہوم' انسانیت کے پژمردہ درخت کو بہارِ نو سے آراستہ کرنے والی شخصیت

میں دو چار منٹ اور لے لونگا۔ کبرہ تکبیرا کی بات بڑی اہم آ گئی۔ عزیزانِ من! يَـٰٓأَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ. قُمْ (74:1-2)۔ ہمارے ہاں وہی ترجمے ہیں کہ ''اے کملی والے! اٹھ''۔ کیا کہتے ہیں کہ جوگی اٹھ! اب قرآن لفظ ''مدثر'' کہاں لے آیا؟ کہا: اے مدثر! اٹھ۔ سوال یہ ہے کہ ''دثر'' کسے کہتے ہیں؟ عزیزانِ من! یوں سمجھو کہ جب درخت تو ہو' مگر اس پہ پوری طرح خزاں آ چکی ہو' اس کے اندر زندگی کے کوئی آثار باقی نہ رہے ہوں۔ اس کا از سرِ نو' نئے برگ و بار لانا' اس کے اوپر نئی بہار آنا' اس میں نئی کونپلیں نکلنا' اس تمام عمل

---

[1] کیا یاد کرو گے کہ بڑے بھائی نے کوئی تقسیم کی تھی! کوئی بات نہیں' ہم اسی میں گزارہ کر لیں گے۔ جاؤ عیش کرو۔

[2] کوٹھے کی چھت سے لے کر آسمان تک تو اس کا ہے' مگر کوٹھا اور اس کوٹھے کا صحن تمہارا!

[3] وہ تو کوٹھے میں دو کرایے داروں کو برداشت ہی نہیں کرتا۔

Marfat.com

(Process) کو ''تدثیر'' کہتے ہیں۔ جو ایسا کر کے دکھائے اسے ''مدثر'' کہتے ہیں۔ ''ہاں! ایسے وہ جو شجرِ کائنات' شجرِ انسانیت' کی خزاں کو پھر سے بہار میں بدلنے کے لیے تمہیں ہم نے بھیجا ہے! اٹھ۔ انسانیت کے اوپر خزاں طاری ہوگئی ہے۔ کہیں کوئی پتی سرسبز نظر نہیں آتی' اٹھ اور اس شاخِ خزاں دیدہ کو پھر سے بہار بنا۔ تیرا فریضہ یہ ہے۔ ابھی اس درختِ انسانیت میں صلاحیت ہے۔ اس درخت کے اندر بہار آ سکتی ہے' از خود نہیں آ سکتی۔ یہ کچھ کرنے کے لیے اٹھ''۔

جنگلوں میں اُگنے والے درختوں کی خزاں کو تو اے خدا! تُو اپنے کائناتی اقتدار کی بناء پہ خود بدل دیتا ہے۔ انسانیت کے درخت کے اوپر جب خزاں آ جاتی ہے' تو اس کے لیے کسی کو اٹھنے کی ضرورت ہوتی ہے عزیزانِ من! قُمْ فَاَنْذِرْ (74:2)۔ ان کو کہو: بتاؤ' اگر اس کی جڑ کے اندر ذرا سا کیڑا لگ جائے تو کتنی تباہیوں کے اندر آ جاؤ۔ یہ درخت ایندھن بن جائے گا۔ اس کی لکڑی جل جائے گی۔ تمہارا یہ درخت تباہ ہو جائے گا۔ ابھی اس میں زندگی کی نمود کی صلاحیتیں باقی ہیں۔ فَاَنْذِرْ (74:2)۔ ان کو آگاہ کرو۔ کہو کہ اُدھر دیکھو' یہ درخت جل رہا ہے' ختم ہو رہا ہے۔ اب کیا کرو؟ کہا کہ وَرَبَّکَ فَکَبِّرْ (74:3)۔ اپنے نشوونما دینے والے کے اس نظام کو قائم کر کے دکھاؤ۔ یہاں لفظ ''اٹھ'' کے لیے قرآن ''قم'' لایا ہے اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ وَرَبَّکَ فَکَبِّرْ (74:3)۔ کو اِدھر سے پڑھیے تب بھی ''ربک فکبر'' آتا ہے' اُدھر سے اُلٹی طرف سے پڑھیئے' تب بھی ربک فکبر آتا ہے۔ گو کہ یہ ایک لطیف سی بات ہے بس یونہی ایک بات ہے جو ذہن میں آئی ہے۔ قرآن نے یہ کہا ہے۔ فَاذْکُرُوْنِیْٓ اَذْکُرْکُمْ (2:152)۔ تم میرے ذکر کو بلند کرو' میں تمہارے ذکر کو بلند کرونگا۔ تم میری تکبیر کا انتظام کرو' میں تمہاری کبریائی کا انتظام کرونگا: وَرَبَّکَ فَکَبِّرْ (74:3)۔ اور پھر اگلی آیت آئے گی تو ان کے معنی بتاؤں گا۔ وہ آیت ہے: وَثِیَابَکَ فَطَهِّرْ (74:4)۔ اس کے لیے ترجمہ کیا ہے: ''اپنے کپڑے دھو کے پایا کر' ایتھے''[1]۔ عزیزانِ من! اپنے آپ کو رَبَّکَ فَکَبِّرْ (74:3)۔ تک رکھیے' ذہن کو دوسری طرف نہ جانے دیجیے۔ یہ ''ربک فکبر'' کیا ہے؟ رسول کو کاہے کے لیے بھیجا تھا: جسے کہا تھا کہ اٹھ اور رَبَّکَ فَکَبِّرْ (74:3)۔ خدا کے نظامِ ربوبیت کو اس طرح متمکن کر دے کہ (Sovereignty) کبریائی صرف اسی کے لیے ہو۔ اس سے خود تمہیں بھی دنیا میں بڑائی حاصل ہو جائے گی (2:152)۔ یہ ہے وہ کام ''جو تم نے کرنا ہے۔ اس لیے اٹھ'' کاہے کے لیے بھیجا تھا؟ یہ تھا وہ منصب جلیل جسے حاصل کرنے کے لیے آپ ﷺ کو بھیجا تھا۔

نظامِ خداوندی دنیا کے ہر نظام پر غالب آ کر رہے گا

هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّهٖ وَلَوْ کَرِهَ الْمُشْرِکُوْنَ (9:33)۔

یہاں اس نے ''شرک'' کہا تھا۔ تمہیں اس لیے بھیجا ہے تا کہ یہ نظامِ خداوندی دنیا کے ہر نظام کے اوپر غالب آ جائے' اس لیے تمہیں بھیجا

---

[1] یہاں اپنے کپڑے دھو کر پہنا کرو۔

Marfat.com

ہے' خواہ شرک برتنے والوں کو یہ بات کتنی ہی ناگوار کیوں نہ گزرے۔ خدا کو جو کام کرنا تھا' رسول کو بھیجا ہی اسی لیے تھا۔ جو عزیزانِ من! خدا کی کبریائی (Sovereignty) کو قائم کرنے کے لیے رسول کو بھیجا تھا۔ 9:33 آیت جو میں نے ابھی پڑھی ہے' وہ یہی ہے کہ "یہ دین تمام ادیان پہ غالب آ جائے"۔ ایک جگہ اور بھی خدا نے قرآن میں اس کبریائی کی' جسے ہم! اللہ اکبر کہتے ہیں' بڑی وضاحت کی ہے۔ آپ دیگر مقامات پر بھی دیکھیے کہ اس کے کیا معنی ہیں۔ ہاں' (40:12) میں قرآن نے کہا کہ یہ کبریائی (Sovereignty) یہ ہے" فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيْرِ (40:12)۔ کہ حکومت صرف اس کی ہو' جو علی مرتبت ہے' ہر قسم کی کبریائی کا مالک ہے۔ اَلْحُكْمُ یہ اس کی تکبیر ہے۔ اَلْحُكْمُ لِلّٰهِ (40:12)۔ حکومت اس کی قائم ہونی چاہیے۔ ایک اور آیت ہے (45:36) فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَرَبِّ الْاَرْضِ وَرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (45:36)۔ یہ کاہش وکاوش' یہ تگ ودو' یہ جہدِ مسلسل' یہ سعی وعمل کاہے کے لیے ہے؟ توڑنے کے لیے نہیں' پرورش کرنے کے لیے ہے۔ یہاں "رب" کا تین دفعہ لفظ دہرایا ہے: رب السمٰوٰت' رب الارض' رب العالمین۔ یہ کس مقصد کے لیے ہے؟ ربوبیت عالمین کے لیے ہے۔ اس کے لیے کیا کرنا ہے؟ وَلَهُ الْكِبْرِيَآءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (45:37)۔ اس کی کبریائی (Sovereignty) خارجی کائنات میں ہی نہیں' والارض میں بھی ہو۔ یہ کبریائی تمہاری اپنی تمدنی' زندگی کے لیے بھی ظاہر (Manifest) ہو وَلَهُ الْكِبْرِيَآءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (45:37)۔ یہ کبریائی قائم کرنے کا (Establish) کرنے کا سوال ہے۔ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (45:37)۔ بتا دو کہ جس طرح کائنات میں اس کا اقتدار ہے' وہ اتنے غلبے کا مالک ہے استبداد کا نہیں ہے بلکہ حکیم ہے' Rationally سب کچھ کرنے والا ہے' اسی طرح ارض کے اندر بھی اس کی کبریائی آئے۔ یہ توحید ہے۔

مذہب کی دنیا میں تکبیر اور کبریائی کی عظمت مسئلے مسائل کی نذر ہو گئی

عزیزانِ من! یہ تھا اس چیز کا مقصد' جسے آپ اللہ اکبر کہتے ہیں۔ دین جب مذہب میں بدل جاتا ہے تو پھر آپ کو معلوم ہے کہ جو وَكَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا (17:111) کا حکم تھا' اس کی تفسیریں پڑھی جاتی ہیں۔ "کبرہ تکبیرا" مسئلہ بن گیا ہے۔ یہ قرآن تو مسئلے مسائل کی کتاب بن گئی ہے۔ مثلاً پہلی تکبیرِ تحریمہ نماز میں اس طرح سے ہے۔ اس تکبیر کے ساتھ جماعت میں شامل ہو' اگر جماعت میں شامل ہو سکے تو پھر تکبیر کے وقت ہاتھ یہاں تک لے جانا۔ اگلا مسئلہ یہ ہوا کہ رکوع میں جاتے ہوئے تکبیر کہنی چاہیے یا نہیں کہنی چاہیے۔ یہ مسئلہ بن گیا۔ تکبیر' نماز سے پہلے اتنی دفعہ' اور اذان میں اتنی دفعہ ہونی چاہیے اور جب صف کھڑی ہوتی ہے تو اس وقت اتنی دفعہ کہنی چاہیے۔ سجدے میں اتنی دفعہ کہنی چاہیے۔ یہ تکبیر تھا کبرہ تکبیرا۔ پھر آپ کے ہاں مذہب میں اس تکبیر کا مطلب یہ ہو گیا کہ تُو اس تکبیریں کہا کر جیسا تکبیریں کہنے کا حق ہے۔ پھر تکبیر کہنے کا حق کیسے ادا ہو؟ ہزار برس سے آپ کے ہاں یہ تکبیر کا مسئلہ حل نہیں ہوتا یہ سارے اختلافات تکبیر کہنے پہ ہیں۔ اب آگے چلیے جناب! یہ تو ہمارے دور کے فقہی مسائل چلے آ رہے تھے۔ مجھے افسوس ہے کہ مجھے ر بار وہ ذکر کرنا پڑتا ہے' ورنہ یہ لوگ قابلِ ذکر نہیں ہیں۔ ہمارے ہاں یہ ہے کہ نہیں صاحب! وہ جو اللہ اکبر کہا جاتا ہے' بہت بڑی

ہے۔ یہ بہت بڑا شرک ہے' جو چلا آتا ہے۔ اللہ اکبر نہیں کہنا چاہیے۔ بھئی! پھر کیا ہو؟ جی! اس کو کبیر کہنا چاہیے' اچھا جی۔ یہ فرقہ اہلِ قرآن والے آئے۔ یعنی اکبر کہنے سے اس کی کبریائی قائم نہیں ہوتی' کبیر کہہ لیجیے' کبریائی قائم ہو جائے گی۔ کبریائی کا تصور نہ وہاں ہے۔ نہ یہاں ہے۔ عزیزانِ من! یہاں تو مصیبت ہی یہ آ گئی کہ قرآن کا نام لے کے وہ انہی مسئلہ مسائل کے اوپر ہی ٹک گئے کہ وَكَبِّرْهُ تَكْبِيرًا (17:111) کا مطلب ہی یہی ہے کہ تکبیر کیسے کہنی چاہیے۔ جو اللہ اکبر کہنا ہے جی! یہ شرک ہے۔ اللہ کبیر کہنا چاہیے صاحب! عزیزانِ من! یہ تو کچھ کہنے کی بات نہیں تھی۔ یہ تو کچھ کرنے کی بات تھی۔

وَكَبِّرْهُ تَكْبِيرًا (17:111)۔ کہا: اس کے اقتدار کو قائم کرو۔ كَبِّرْهُ یہ Sovereignty ہے' جس پر کسی اور کا اقتدار نہ ہو۔ یہ ہے اکبر! کتنا بڑا انقلابی اعلان تھا عزیزانِ من! جو آپ کے ہاں' ساری دنیا میں بیک وقت کوٹھے پہ کھڑے ہو کے' جسے آپ کہتے ہیں میناروں پہ کھڑے ہو کے' آپ ساری دنیا میں کہتے ہیں: اللہ اکبر اقتدار اور وہ بھی اس انداز سے جیسے کہ آپ انگریزی میں کہتے ہیں:

Soverignty belongs to Him and Him alone

کوئی اور اس اقتدار میں شریک نہیں ہے۔ ہم اسے یوں نہیں مانتے۔ میں کہتا ہوں اتنی بار دہرانا بھی واقعی اس کے اندر ایک حقیقت ہے۔ بار بار دہراؤ۔ دنیا سے کہو کہ ہم کسی کے اقتدار کو نہیں مانتے۔ وہ کہنے والی قوم تھی اور اس کے بعد اب یہ مسئلہ بن کر رہ گیا کہ پھر یہ تکبیریں کیسے کہی جائیں گی؟ آپ نے غور فرمایا کہ دین جب مذہب میں بدلتا ہے تو کیا بن کے رہ جاتا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اس اطاعت ثواب کا اثر کیا ہوگا؟ کچھ نہیں ہوگا۔ امام مصائب نظری میں الجھ گیا ہے۔ یہ سارے مسائل میں الجھ گئے ہیں۔ یہ مذہب ہے۔ دین میں تو اس کا سوال ہی نہیں عزیزانِ من! اس مذہب کے اندر چار رکعتیں ہیں یا دو رکعتیں ہیں' اکبر کہنا چاہیے یا کبیر کہنا چاہیے' سب کا مفہوم اتنا ہی ہے کہ جو مذہب کا فریضہ ہے وہ پورا ہو جائے۔ دین وہ ہے کہ تکبیر اسی کی تکبیر ہے' عزیزانِ من! جو خدا کے اقتدار کو عملاً ثابت کرنے کے لیے کوئی جدوجہد کرتا ہے۔ یہ ہوگا۔ وَكَبِّرْهُ تَكْبِيرًا (17:111)۔

سورۃ بنی اسرائیل آج ختم ہوگئی' آئندہ اتوار کو سورۃ الکہف لیں گے' جو اٹھارہویں سورۃ ہے اور اس کی چند ایک آیات کے اندر میں سمجھتا ہوں کہ یہ پندرہواں پارہ بھی ختم ہوتا ہے۔ اس طرح اس سورۃ کی 74 آیات تک آدھا قرآن' جسے ہم نصفِ قرآن کہتے ہیں' کے دروس پورے ہو جائیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ.

❁❁❁❁

میرا فہمِ قرآن حرفِ آخر نہیں

اس حقیقت کا دُہرا دینا ضروری ہے کہ میں قرآنِ کریم کے متعلق جو کچھ پیش کرتا ہوں وہ بہرحال ایک انسانی کوشش ہوتی ہے جو نہ سہو و خطا سے منزہ ہو سکتی ہے اور نہ ہی اسے حرفِ آخر قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس مجموعہ میں' میں نے اسی لئے صرف قرآنی آیات کو پیش کیا ہے۔ البتہ کہیں کہیں ان آیات کے مفہوم سے استنباطِ نتائج کیا ہے اگر آپ کو ان نتائج سے اتفاق نہ ہو تو آپ انہیں نظر انداز کر دیں اور قرآنی آیات پر غور و تدبر کے بعد' خود کسی نتیجہ پر پہنچ جائیں۔ میرا مقصد اپنی وسعت و استطاعت کے مطابق' رہ نوردانِ جادہ قرآنی کے لئے سہولتیں بہم پہنچانا ہے تاکہ وہ بآسانی منزلِ مقصود تک پہنچ سکیں۔ میں ان کا رفیقِ سفر بننا چاہتا ہوں' خضرِ راہ نہیں اور میرے لئے یہی سعادت بہت ہے۔

(پرویز۔ قرآنی قوانین)

Marfat.com

کتابیات

سورۃ بنی اسرائیل کے اشاعتی مراحل میں جن کتب کو پیش نظر رکھا گیا ہے ان کی تفصیل درج ذیل ہے

۱۔ پرویز: لغات القرآن (جلد اول' بار اول) ادارہ طلوع اسلام' لاہور' ۱۹۶۰

۲۔ پرویز: لغات القرآن (جلد دوم' بار اول) ادارہ طلوع اسلام' لاہور' ۱۹۶۰

۳۔ انوار ہاشمی: تہذیب کی کہانی (نیا ایڈیشن)' کراچی بک سنٹر کراچی' ۱۹۷۹

۴۔ بستانی بطرس: محیط المحیط' بیروت' ۱۸۷۰

۵۔ پرویز: لغات القرآن (جلد سوم' بار اول) ادارہ طلوع اسلام' لاہور' ۱۹۶۱

۶۔ پرویز: لغات القرآن (جلد چہارم' بار اول) ادارہ طلوع اسلام' لاہور' ۱۹۶۱

۷۔ پرویز: سلیم کے نام خطوط (چوتھا ایڈیشن)' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ لاہور' ۱۹۶۶

۸۔ پرویز: شاہکار رسالت..... حضرت عمر فاروق..... (ایڈیشن چہارم) ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ لاہور' ۱۹۸۷

۹۔ پرویز: برقِ طور (ایڈیشن چہارم)' ادارہ طلوع اسلام لاہور' ۱۹۹۳

۱۰۔ پرویز: مذاہب عالم کی آسمانی کتابیں (پانچواں ایڈیشن)' طلوع اسلام (ٹرسٹ رجسٹرڈ)' لاہور' ۱۹۹۶

۱۱۔ پرویز: شرح مثنوی اسرارِ خودی و رموز بے خودی' طلوع اسلام ٹرسٹ' لاہور' ۱۹۹۶

۱۲۔ پرویز: مطالب الفرقان فی دروس القرآن سورۃ النحل (ایڈیشن اول)' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ لاہور' ۲۰۰۳

۱۳۔ ڈاکٹر عبدالسلام' ڈاکٹر عبدالحق حسرت کاسگنجوی' شاہد عشقی' خالد وہات' ساقی جاوید' اور محمد ناظم خان ماتلوی' گلزار اردو (حصہ دوم) سندھ ٹیکسٹ بورڈ' جام شورو' ۱۹۹۵

۱۴۔ ڈاکٹر محمد اقبال ضرب کلیم' نیشنل بک فاؤنڈیشن' اسلام آباد' ۱۹۹۶

۱۵۔ ڈاکٹر محمد اقبال: ارمغانِ حجاز اردو' نیشنل بک فاؤنڈیشن' لاہور' ۱۹۹۶

۱۶۔ ڈاکٹر محمد اقبال: بال جبریل' نیشنل بک فاؤنڈیشن' لاہور' ۱۹۹۶

۱۷۔ ڈاکٹر محمد اقبال: بانگِ درا' نیشنل بک فاؤنڈیشن' لاہور' ۱۹۹۶

۱۸۔ رامپوری آسی ضیائی' ایم ایس طاہر شادانی اور حفیظ الرحمٰن احسن' تحسین اردو' ایوانِ ادب' لاہور' ۱۹۹۲

۱۹۔ روزنامہ جسارت' کراچی' مجریہ ۲۵ ستمبر ۲۰۰۳ (خصوصی اشاعت)

۲۰۔ فیروز اللغات اردو جدید (نیا ایڈیشن)' فیروز سنز لمیٹڈ' لاہور

۲۱۔ علامہ تمنا عمادی و دیگر علمائے کرام: امام زہری (حدیثِ سیرت کے مدون اوّل) و امام طبری (تفسیر و تاریخ کے مدون اول) تصویر کا دوسرا رخ' الرحمٰن پبلشنگ ٹرسٹ (رجسٹرڈ)' کراچی

۲۲۔ علامہ محمد اسلم جیراجپوری: مجلّہ طلوع اسلام اگست ۱۹۶۸

۲۳۔ مرزا اسد اللہ خان غالب: دیوان غالب' جہانگیر بک ڈپو' لاہور ۲۰۰۲

BIBLIOGRAPHY

English Section

24 Dorland's Pocket Medical Dictionary (24th edition), Oxford & IHB Publishing Co., Pvt., Ltd., New Delhi, 1987.

25 Manzoor-ul-Haque, Dr.: The Quran's Concept of Self Integration; The Motive-Valence for Learning, Slamming new Intrusions and old Obsessions, Islamic University: Quarterly Academic Journal, ICIS, London, Vol I, No. 3, 1994, pp 7-24.

26 Reader's Digest Universal Dictionary, Reader's Digest Association Limited, London, 1990.

Marfat.com